خاکِ تمنّا

سراج انور

ناولستان۔ جامعہ نگر۔ نئی دلّی ۲۵

تقسیم کار
صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر نئی دلّی ۱۱۰۰۲۵

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار دلّی ۱۱۰۰۰۶

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
شمشاد مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

اگست ۱۹۷۴ء　　بار اوّل　　قیمت ۱۱/۵۰

(کوہ نور پرنٹنگ پریس۔ دلّی)

پیش لفظ:۔

سراج انور صاحب کی یہ تخلیق "خاکِ تمنا" اپنی تمام تر فنکارانہ خصوصیات کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ ناول کی دنیا میں سراج صاحب کی یہ تخلیق ان کی پہلی کوشش نہیں ہے، شبنم اور گل وسنگ کے خالق کے روپ میں وہ خود کو پہلے بھی ادبی دنیا سے روشناس کرا چکے ہیں۔ لیکن صرف شبنم اور گل وسنگ کے خالق کی حیثیت سے سراج صاحب کا تعارف کرا دینا کافی نہیں ــ فنی خصوصیات اور فنونِ لطیفہ سراج صاحب کی سرشت میں شامل ہیں۔ ان کے بے شمار مزاحیہ ڈرامے آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہو کر سامعین سے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں مزاحیہ عنصر اس قدر غالب رہتا ہے کہ سنجیدہ سے سنجیدہ انسان ان کو سن کر اپنی ہنسی پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ خود سراج صاحب کی زندگی اِن ہی شیریں اور لطیف عناصر کا مجموعہ ہے۔ ان کی طبیعت کی شوخی، شگفتگی اور بذلہ سنجی وظرافت ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔

ڈراموں سے قطع نظر ناولوں میں بھی ان کی طبیعت کا یہ فطری میلان نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ سنجیدہ سے سنجیدہ مواقع پر جہاں قاری نہایت انہماک اور خاموش دور سے گذر رہا ہوتا ہے وہاں ان کے قلم کی ذراسی جنبش قاری کو ایک روشنی کی دنیا میں لا کر مسرتوں سے ہمکنار کر دیتی ہے۔

یہ بات ایک عام فنکار کے بس کی بات نہیں۔ یہ بات تو صرف وہی شخص پیدا کر سکتا ہے جس کا نقطۂ نظر صرف یہ ہو ——

"زندگی رونے اور بسورنے کے لئے عطا نہیں کی گئی ہے۔ اس میں ہنسنا ضروری ہے۔ ایک ذرا سی مسکراہٹ زندگی کے بے حد بڑے پیٹ کی خوراک ہے۔"

زیرِ نظر ناول "خاکِ تمنا" اپنے واقعات، کردار اور پلاٹ کے لحاظ سے ایک جیتی جاگتی، چلتی پھرتی اور زندگی کی حقیقتوں کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ اس میں ہیرو کا کردار آج کل کے ہر اس نوجوان کی تصویر پیش کرتا ہے جو ذہنی خلفشار، محرومی اور ناکامی (FRUSTRATION) میں مبتلا ہے۔ اسے جہاں کہیں ہمدردی و محبت کے دو بول سننے کو مل جاتے ہیں یا جہاں کسی حسین کی نظر التفات محسوس ہوتی ہے اس کا دل بے ساختہ اس کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ اس نوجوان کے اس کردار کو ہری جگ قسم کے کردار سے تشبیہہ دینا قطعی غلط ہے۔ آج کا نوجوان ایک ایسے مسافر کی مانند ہے جو جہاں گھنی چھاؤں دیکھتا ہے وہیں پڑاؤ ڈال کر زندگی گذارنے کا عزم کر لیتا ہے۔

محبوب علی مجذوب کے کردار میں مصنف نے لاشعوری طور پر ایسی گلکاریاں کی ہیں کہ بے ساختہ مسکرانے کو جی چاہتا ہے۔ ہر ہر لمحہ اس کی باتیں اور اس کے جملے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو ہنستے اور مسکراتے ہوئے نبرد آزما ہونے کا درس دیتے ہیں۔ اسی طرح ہیروئن کے باپ کے روپ میں ایک ایسے شخص کا کردار پیش کیا ہے جس کے ناتواں کاندھوں پر تمام زندگی کا بوجھ رکھا ہوا ہے۔ لیکن وہ دل جوان رکھتا ہے اور ہر

مصیبت کو خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہے۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصنف نے بڑی جگر کاری سے ایک ایک کردار کو اس کے حقیقی روپ میں پیش کیا ہے۔ ناول کے آخر میں ڈرامائی کیفیت ہونے کے باوجود اس کے غیر حقیقی ہونے کا گمان تک نہیں گذرتا اور قاری آخر تک گرد و پیش کے ماحول سے بے نیاز رہ کر ناول کی دنیا میں کھویا رہتا ہے۔

محمد رضا
ریسرچ اسکالر دلی یونیورسٹی
دلی

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا یہ ہے

۱

"ابھی اور کتنے اوپر جانا ہے بھئی؟" سانس کے زیر و بم کے ساتھ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

"بس شاب، ایک دو فرلانگ اور ٹھہرا" پہاڑی مزدور بھی سانس لینے کے لئے چند لمحوں کے لئے رک گیا۔ اور اس عرصے میں ساجد گردن اٹھا کر پگڈنڈی کو دیکھنے لگا۔

کسی غمزدہ دوشیزہ کی پریشان لٹوں کی طرح لہراتی اور بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی، آگے جا کر کئی ہزار فٹ اونچی پہاڑی کے سینے میں گھس جاتی تھی۔ جوں جوں یہ ننھی سی پگڈنڈی اوپر چڑھتی جاتی، لہراتے ہوئے سرمئی بادل اسے اپنی آغوش میں لے لیتے اور تب وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔

اگر کوئی ایسے میں اس طرف دیکھتا تو یہی محسوس کرتا کہ آگے ایک خلا ہے ـــــ ایسا خلا جو ساجد کے کھوکھلے دل کی وسعت کے مقابلے میں

کچھ بھی نہ تھا!

سانس کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ پہاڑی کے دامن میں جھلمل کرتی ہوئی گہری اور نیلی جھیل کو دیکھنے لگا۔ قدرت نے اسے کچھ اس طرح بنایا تھا کہ اِس مقام سے وہ ایسی دکھائی دیتی تھی گویا کسی معصوم اور الھڑ حسینہ کی نشیلی آنکھ ہو!

ایسی آنکھ جو غموں کے بوجھ سے ہر لمحہ نیم وا رہتی ہے اور جس میں دل پانی بن کر بار بار آجاتا ہے۔

جھیل کے چاروں طرف آبادی تھی۔ کوٹھیاں اور عالیشان بنگلے تھے اور ان کے مکینوں کے پُرمسرت دلوں میں آلام و مصائب کی اتنی سی بھی تو رمق نہیں تھی ــــ غموں کا ذرا سا بھی تو سایہ نہیں پڑا تھا! ــــ یہی وجہ تھی کہ ان کے چہرے کندن کی طرح چمکتے تھے اور جب ان کی نظریں نوواردوں پر پڑتیں تو حیرت کے مارے کھِل سی جائیں ــــ اتنا روکھا پھیکا سا چہرہ ــــ یہ نوجوان اتنے زرد رو کیوں ہیں؟

وہ سوچ رہا تھا کہ نوجوان ہمیشہ ہی تو زرد رو نہیں ہوتے ـ با غمِ جاناں جب کسی کو لگ جائے تو اس کی یہی حالت ہوتی ہے۔ دل کا تمام خون جب پانی بن کر آنکھوں کے راستہ بہہ جائے تو کس کا چہرہ ایسا نہ ہوگا!۔ اندر ہی اندر جلنے والے؛ نوجوان اپنے غم کا مداوا چاہنے کے لئے ان پہاڑی مقامات پر آتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پہاڑی مقامات سے خدا بہت قریب رہ جاتا ہے!

اور جب یہ قربت کسی کو حاصل ہو جاتی ہے تو شکوے شکائیتوں کے دفتر کھل جاتے ہیں۔ کم بخت دل کا رونا رونا پڑتا ہے ــ کیوں دیا ہے یہ

دل ؟ اگر دیا تھا تو پھر ناکامیاں اور محرومیاں کیوں مقدر میں لکھ دیں!

ساجد بھی ایسے ہی نوجوانوں میں سے ایک تھا۔ زرد رو اور لاغر ساجد۔ جس کی نس نس میں غم رچا ہوا تھا۔ جس پر آلام نے اتنا گہرا سایہ ڈالا تھا کہ اب جبکہ وہ اس ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر جا رہا تھا تو دل پر چھائے ہوئے اندھیروں کے باعث پتلی سی پگڈنڈی اُسے نظر ہی نہ آتی تھی۔ وہ لڑکھڑا جاتا اور پھر پیچھے سے پہاڑی مزدور اُسے تنبیہہ کرتا کہ وہ چٹانوں کا سہارا لے کر چلے۔ ہر ہر قدم وہ دل پر جبر کر کے اُٹھا رہا تھا۔ نجمی صاحب کے بنگلے پر جانے میں اس کے اپنے ارادے کو قطعی دخل نہ تھا۔ وہ تو محض ان کے بلاوے پر ان کی دلجوئی کے لئے وہاں جا رہا تھا۔ کبھی کبھار رُک کر وہ قدرت کے ان حسین مناظر کو دیکھنے لگتا جو پوری کائنات پر چھائے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ دُور دُور تک ـــ نیلگوں دھوپ کی آغوش میں نظر جیسے جیسے ان مناظر کا تعاقب کرتی۔ کہُر کے دبیز پردے اُن پر حاوی ہوتے جاتے ـــ سانس درست کر کے وہ پھر چڑھنے لگتا اور ٹہنیوں میں ڈیکے ہوئے خودرو پھول اپنے ننھے مُنّے سر نکال کر اسے حیرت سے دیکھنے لگتے ـــ

اُسے نجمی صاحب کے ہاں آئے ہوئے کئی دن ہو چکے تھے۔ مگر وہ گھر میں نہیں ٹکتا تھا۔ ان کا کمرہ کافی بلندی پر تھا مگر ساجد کو اس سے بھی اونچا پہنچنے کی خواہش تھی۔ وہ روزانہ پہاڑ کی چوٹی تک بغیر کسی سے کہے سنے بالکل تنہا چلا جاتا۔ اس راستہ کو دیکھتا جس پر بادل بری طرح نثار ہوتے تھے۔ بعد میں یہ راستہ فضاؤں میں تحلیل ہو جاتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا کہ آگے ایک خلا ہے اس نے اگر ذرا بھی قدم آگے بڑھایا تو پہاڑی کی لامحدود گہرائیوں

میں ہمیشہ کے لئے گم ہو جائے گا!

وہ آگے قدم بڑھاتا تو راستہ پھر نظر آنے لگتا۔ خلا بھر جاتا اور اور وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ سوچتا ۔۔ یہ کیسا خلا ہے جو فوراً پُر بھی ہو جاتا ہے۔ کوئی ذرا میرے دل کے خلاؤں میں جھانک کر دیکھے۔۔ بھیانک ظلمت ۔۔ گہرے اندھیرے اور سناٹے ۔۔ اور پھر ویرانی ہی ویرانی ۔۔ ایک پر ہول خاموشی ۔۔ بس اور کچھ نہیں ملے گا۔

اب وہ اتنی بلندی پر آ گیا تھا کہ جھیل میں لہراتی ہوئی کشتیاں اُسے کاغذ کی ناویں نظر آتی تھیں۔ دوشیزہ کی اداس آنکھ آہستہ آہستہ بند ہوتی جا رہی تھی۔ بادلوں کو خود سے نیچے پرواز کرتے دیکھ کر وہ خود کو بہت بلند محسوس کرتا تھا ۔۔ اوہ! آج پوری کائنات کو وہ ایک نظر ڈال کر دیکھ سکتا ہے اور ایک دن وہ تھا جب پوری دنیا اُسے تنگ و تاریک کوٹھری کی طرح دکھائی دیتی تھی۔!

بادل اب آہستہ آہستہ اُسے ڈھکنے لگے تھے۔ ایک ساعت کے لئے اسے ایک خوشگوار بو محسوس ہوتی تھی۔ ہلکی سی نمی اور ننھی منی بوندیں اس کے گالوں پر چھوڑتے ہوئے یہ بادل پھر تیزی سے آگے بڑھ جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا گویا وہ کسی اور ہی دنیا میں آ گیا ہے۔ چند لمحوں کے لئے اسے زندگی مل گئی۔ وہ اپنے غم بھول گیا۔ اپنے ماضی کو بھول گیا ۔۔ سب کو بھول گیا۔ ایسے خوشگوار لمحات بھلا کسے میسر آتے ہیں۔ شہروں میں یہ خوشی کبھی نہیں ملتی ۔۔ وہاں تو بادل ایک عجوبہ معلوم ہوتے ہیں!!

اُس نے تہیہ کر لیا کہ چوٹی پر پہنچ کر ہی دم لے گا ۔۔ کون جانے کہ چوٹی کے اس پار کوئی چھپی ہوئی جنت ہو اور وہ جنت کسی ایسے مسافر کی راہ

تک رہی ہو جو چوٹی کو عبور کر کے پیچھے سے وہاں آ جائے گا۔!

وہ خیالات کے تانے بانے بنتا ہوا اوپر چڑھتا رہا۔۔۔ چڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ انجانی چوٹی آ گئی۔ اُڈتے بادلوں نے اِس چوٹی کو اپنی آغوش میں دبوچ رکھا تھا۔ چیڑ کے قد آور درختوں سے بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ ٹپ ٹپ۔۔ ٹپ ٹپ! ایک پراسرار سکوت پوری چوٹی پر محیط تھا۔ اتنی بلندی سے جھیل کو دیکھتے ہوئے اسے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا وہ کوئی آسمانی مخلوق ہے جو بادلوں کے دبیز پردے سرکا کر زمین کو شوق و استعجاب سے دیکھ رہی ہے۔۔۔ ایک عجیب مسرت۔۔۔ ایک انجانا نشاط اس کی رگ رگ میں سرایت کرنے لگا۔

اُس نے چیڑ کے گھنیرے درختوں کو غور سے جب دیکھا تو اُسے یوں لگا گویا کوئی سفید سا ہیولا درخت کے تنے سے لگا کھڑا ہے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے بادل کا ایک ٹکڑا دھیرے دھیرے گذر رہا تھا۔ اِسی لئے وہ اُس مہ جبیں کو صاف طور سے نہیں دیکھ سکا تھا۔ جو پہلی نظر میں اُسے ایک ہیولا دکھائی دی تھی۔ دُھند جیسا ہٹی تو اُس نے غور سے دیکھا۔

وہ زیبا تھی۔۔۔ سچ مچ زیبا تھی!

زیبا اور یہاں؟۔۔۔ وہ دیوانہ وار اس طرف بڑھا۔ اشتیاق اتنا شدید تھا کہ اسے اپنے گرنے کی بھی پروا نہیں تھی۔ جیسے ہی وہ درخت کے قریب پہنچا۔ زیبا اچانک فضا میں تحلیل ہونے لگی۔ بالکل ایسے ہی جیسے بادل ہوا میں جذب ہو جاتے ہیں۔ اس نے پاگلوں کی طرح درخت کے ہر سمت گھوم کر دیکھا مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا!

سر تھام کر وہ تھکے ہوئے انداز میں وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔۔۔

—— تو کیا یہ سب خواب و خیال تھا۔ آخر اس کا تصور اسے چین کیوں نہیں لینے دیتا۔ اسے زیبا کی غیر مرئی شبیہہ کیوں نظر آتی ہے۔؟

اسے مسوری تک کا وہ سفر یاد آگیا جو اس نے زیبا کی ہمراہی میں طے کیا تھا۔ حدِ نظر تک برف پوش چوٹیاں اور گنگناتی آبشاریں پھیلی ہوئی تھیں۔ جب اُسے اُن گلیشیرز کا خیال آیا جہاں اس نے برف کی گیندیں بنا کر زیبا کے ماری تھیں تو آپ ہی آپ اس کا سر گھٹنوں سے جا لگا۔ اس کے گالوں پر لرزتی ہوئی بوندوں میں اب وہ آنسو بھی شامل ہو گئے جو دراصل دل سے اُٹھتے ہوئے بادلوں نے پیدا کئے تھے۔

وہ اتنا رویا —— اتنا رویا کہ اس کی ہچکی بندھ گئی!

سورج کی نارنجی کرنیں برف پوش چوٹیوں پر جلا کر رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ پورا ماحول اداس ہونے لگا۔ اس کے دل سے نکلتے ہوئے نوحے اب وادیوں میں گونج رہے تھے۔ شام ہو رہی تھی اور ساتھ ہی ایک مسلسل سکوت فضا پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔

وہ اسی طرح گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا کہ پشت سے آواز آئی۔

"کیا سوچ رہے ہو بیٹے؟"

اس نے سر گھما کر پیچھے کی جانب تعجب سے دیکھا۔ نجمی صاحب جو رشتے میں اس کے دور کے چچا ہوتے تھے، اپنی موٹی سی لکڑی کا سہارا لئے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر تبسم تھا اور مسکراتی ہوئی آنکھوں سے وہ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اسے ہرگز یہ توقع نہ تھی کہ پچاس سال کے نجمی صاحب اسے تلاش کرتے ہوئے اتنی بلندی تک بھی آسکتے ہیں۔ ! حیرت کے مارے اس کی زبان سے صرف اسی قدر

نکل سکا۔

"چچا ۔۔ آپ؟"

"ہاں بیٹے ۔۔ میں۔" وہ قریب آکر اس کے پاس بیٹھ گئے۔

"مگر ۔۔ مگر ۔۔"

"میں سمجھ گیا تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" انھوں نے جھیل کو تکتے ہوئے کہا ۔۔ "واقعی میری عمر کا تقاضا یہ نہ تھا کہ میں اتنی اونچائی تک آسکتا ۔۔ لیکن بیٹے، انسانی عزم کے آگے یہ بلندیاں کچھ بھی نہیں ہیں۔ ارادہ مستحکم ہو تو انسان سب کچھ کر سکتا ہے ۔۔ ویسے کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ مجھ سے پوچھے بغیر تم روزانہ یہاں کیوں آجاتے ہو۔؟"

"مجھے سکون چاہیئے۔ اور قدرت کے یہ مناظر مجھے قلبی تسکین پہنچاتے ہیں چچا۔" اس نے عمیق ترین گہرائیوں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"مان لیا ۔۔ بالکل درست ہے۔" نجمی صاحب اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اور مسکرا کر بولے۔ "لیکن تم سوچ کیا رہے تھے؟۔ اگر میری نظریں دھوکا نہیں کھا رہیں تو شاید تم روتے بھی رہے ہو۔؟"

"نہیں چچا۔" وہ زبردستی مسکرایا۔ "میرے گالوں پر تو یہ بادلوں کی بوندیں ہیں۔"

"تم سے زیادہ عمر ہے میری اور تجربہ بھی اس لحاظ سے زیادہ ہی ہے۔"

"میں رو نہیں رہا تھا آپ کو غلط فہمی ہے۔"

"میری آنکھوں میں دیکھ کر جواب دو کہ تم کیوں رو رہے تھے؟" نجمی صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں ـــ میں" وہ کچھ نہ کہہ سکا اور پھر رو پڑا۔ ٹوٹا ہوا دل ہمدردی کی تاب نہ لا سکا۔

"میں تمہارے کرب و غم کو جانتا ہوں ساجد" نجمی صاحب اس کی کمر پر تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ "لیکن دل کا راز کہہ دینے سے بے چینی کم ہو جاتی ہے۔"

"آپ جانتے تو ہیں کہ مجھے کون سے غم ہیں" ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اس نے نجمی صاحب کو دیکھا۔

"پھر بھی ـــ میں تمہارے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔"

چند لمحوں تک وہ بڑھتے ہوئے اندھیروں کو گھورتا رہا۔ برفیلی ہواؤں نے درختوں سے سرگوشیاں کرنی بند کر دی تھیں۔ جھیل کے ساکن پانی پر کشتیاں آپ ہی آپ ٹھہر گئی تھیں۔ شام ہو چکی تھی۔ سورج پہاڑوں کے دامن میں روپوش ہو چکا تھا۔ اس نے نجمی صاحب کے پرشفقت چہرے پر ایک نظر ڈالی اور پھر بولا۔

"میں یہ سوچ رہا تھا چچا کہ سورج کے طلوع ہوتے ہی فرشتے انسانوں میں کتنی مسرتیں بانٹتے ہیں! لیکن شام ہوتے ہی سب کچھ فنا ہو جاتا ہے۔ ایک مسلسل سکوت، ایک طویل خاموشی ہر شے کو گھیر لیتی ہے۔ دیکھیے، یہ پورا خطہ کچھ دیر پہلے جنت تھا لیکن شام کی آمد کے باعث جہنم بن گیا ہے۔ طلوع آفتاب کے وقت مسرت کا طوفان انسانوں میں زندگی بکھیرتا چلا گیا۔ لیکن شام ہوتے ہی یہ خوشیاں ان سے چھین لی گئیں ـــ میری اپنی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہے چچا۔"

"تم فلسفی ہو، یہی تمہاری سب سے بڑی خامی ہے۔" نجمی صاحب

بولے ۔ "ایسی باتیں ہم جیسے عمر رسیدہ لوگوں کو زیب دیتی ہیں تم جیسے جوانوں کو نہیں ۔ کلیاں اگر پیدا ہوتے ہی مرجھانے لگیں، تو جانتے ہو کیا ہوگا ۔ — زندگی کا یہ ہرا بھرا باغ اجڑ جائے گا جس میں ان دنوں ہم اور تم اپنے سانس گن رہے ہیں — زندگی رونے اور بسورنے کے لئے عطا نہیں کی گئی ہے — اس میں ہنسنا ضروری ہے — ایک ذرا سی مسکراہٹ زندگی کے بے حد بڑے پیٹ کی خوراک ہے — کچھ سمجھے — ؟"

"مجھے معلوم ہے چچا — لیکن کیا کروں، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح سورج کے ڈوبتے ہی فضا پر ایک ماتم سا طاری ہو گیا ہے، کون جانے کہ یہ ہمیشہ کے لئے میرے دل پر تسلط کرے ۔!"

"اچھا اب اٹھو ۔" نجمی صاحب نے کہا ۔ "باتیں راستے میں بھی ہو سکتی ہیں ۔ یہاں بیٹھے رہے تو پھر نیچے اترنا دشوار ہو جائے گا ۔"

وہ خاموشی سے اٹھ کر ان کے ساتھ نیچے اترنے لگا ۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں راستہ دیکھتے ہوئے چل رہے تھے ۔

"تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا ساجد — یاد ہے ؟"

"ہاں یاد تو ہے —" اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا ۔

"تو پھر — پھر تم کیوں رنجیدہ ہو ؟ ۔ تم نے کان پکڑے تھے کہ آئندہ کبھی افسردہ نہ ہو گے اور زیبا کے بارے میں کچھ نہ سوچو گے — پھر آج یہ کیفیت کیوں — تمہیں شاموں کی فکر ہے نا — تو سن لو کہ شامیں کبھی اداس نہیں ہوتیں ۔ شامیں ہمیشہ حسین و رنگین ہوتی ہیں — یہی سورج جو اس وقت یہاں ڈوبا ہے، اسی لمحے کہیں اور نکل کر مسرت کی صبح ثابت ہوگا ۔ مسرت کا سورج غم کی بدلیوں کے پیچھے ہمیشہ ہی نہیں چھپا رہتا — یہ بدلیاں

بہت جلد ہٹ جایا کرتی ہیں ۔۔۔"

۲

اب وہ جھیل کے کنارے آکر ایک بنچ پر بیٹھ چکے تھے۔ نو بیاہتا جوڑے ماہِ عسل منانے کے لئے پہاڑوں پر آئے ہوئے تھے اور ان میں سے چند جوڑے درختوں کے نیچے محوِ اختلاط تھے۔ جھیل کے چاروں طرف برقی قمقمے لگے ہوئے تھے۔ ساکن پانی پر جب ہوا کا کوئی جھونکا ارتعاش پیدا کرتا تو پانی میں منعکس قمقمے بار بار جھومتے تھے۔ ساجد نجمی صاحب کی دلبستگی سے کافی متاثر ہوا تھا۔ لہذا اس نے کہا ۔۔۔

"میں آپ کی بات مانتا ہوں چچا لیکن کیا کروں؟ مجھے ان اودے اودے پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ یہ گہری نیلی جھیل قطعی اچھی نہیں لگتی۔ چیڑ کے یہ لمبے لمبے درخت جب ہوا کے بوجھ سے جھومتے ہیں اور جب ان کے پتوں سے ہوا راز و نیاز کرتی ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا میری بے بسی پر تالیاں پیٹ رہے ہوں۔! زیبا کے بغیر میری زندگی کتنی ویران اور کتنی تنہا ہو گئی ہے۔ یہ تو کچھ میرا ہی دل جانتا ہے۔"

"مانتا ہوں ۔۔۔ یہ بھی حقیقت تسلیم کرتا ہوں کہ زیبا بڑی پیاری لڑکی تھی اور اس کے سوا اس وسیع دنیا میں تمہارا کوئی نہیں تھا ۔۔۔ لیکن ...."

نجمی صاحب چند لمحے تک تڑپتی مچلتی لہروں کو دیکھتے رہے اور پھر

بولے ۔۔۔

"لیکن بیٹے، اگر پھول شاخوں کی گودیں مرجھایا نہ کریں تو جانتے ہو کیا ہوگا؟"

"کیا ۔۔۔؟"

"نئے پھول ہرگز نہ کھل سکیں گے۔"

"لیکن نئے پھول کھلنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

"بڑی ضرورت ہے، نئے پھولوں میں تازگی ہوتی ہے، رعنائی ہوتی ہے، خوشبو ہوتی ہے ۔۔۔ وہ دنیا کے رہنے والوں کی نظروں کو نور اور دلوں کو سرور عطا کرتے ہیں ۔۔۔ پھولوں کا یہ احسان کیا کچھ کم ہے ۔۔۔؟ ہر وہ پھول جو ایک دن شاخ کی گود میں پروان چڑھتا ہے، کسی نہ کسی دن مرجھاتا ضرور ہے۔"

ہواؤں میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی اور پہاڑی مزدوروں کے ہاتھ بغلوں میں جا چکے تھے۔ وہ صرف ایک قمیص اور سویٹر پہنے ہوئے تھا۔ نجمی صاحب نے اسے محبت بھری نظر سے دیکھا اور پھر اپنے گلے سے اونی مفلر اتار کر اس کی گردن کے گرد لپیٹ دیا۔

"زندگی بہت قیمتی شے ہے، اس کی قدر کرنا سیکھو۔ یوں اپنی جان کے پیچھے نہیں پڑا کرتے۔"

نجمی صاحب کی بات سن کر وہ کچھ دیر تک خاموش رہا اور پھر لسورتے ہوئے بولا۔

"زیبا تو مرجھانے کے لئے نہیں تھی۔ وہ تو ابھی ایک نوشگفتہ کلی تھی، قدرت کے ظالم ہاتھوں نے اسے کیوں توڑا ۔۔۔ کیا مل گیا اسے؟"

"سکون اور مسرت" نجمی صاحب آہستہ سے بولے۔

"چچا نجمی ۔۔۔!" حیرت و تعجب سے اس نے تقریباً چیخ کر کہا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بیٹے۔ باغ میں جاتے وقت ہم بھی تو نو شگفتہ کلیوں کو محض اپنی مسرت کی خاطر توڑ لیتے ہیں۔ دنیا بھی ایک باغ ہے اور ہم اور تم اس میں کھلنے اور مرجھانے والے پھول۔ قدرت بھی اپنی خوشی کی خاطر جو پھول بھی اسے پسند آتا ہے، توڑ لیتی ہے۔"

وہ حیرت اور تعجب سے کچھ دیر تک نجمی صاحب کو دیکھتا رہا۔ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر سسکیاں لیتے ہوئے بولا۔

"میری پُر مسرت زندگی میں یہ تغیر کیوں آگیا۔؟ — کیا میں ہمیشہ ایسا ہی رہوں گا؟ مجھے کسی کی اتنی سی محبت بھی نہ مل سکے گی۔؟"

"حوصلہ رکھو بیٹے"

نجمی صاحب کی بات پر ذرا بھی دھیان دیئے بغیر وہ پھر کہنے لگا۔

"دیکھا جائے تو میں ہمیشہ سے محبت کا بھوکا رہا — اماں مجھے محبت نہ دے سکیں اور بچپن ہی میں اس دنیا سے دور چلی گئیں۔ لڑکپن میں ابا بھی مجھے تنہا چھوڑ گئے — کالج کی بیشتر لڑکیوں نے میرے ساتھ محبت کے کھیل کھیلے اور مجھے فریب دے دے کر چلتی بنیں۔ اس کے بعد میں نے زیبا کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا۔ اس کی محبت نے مجھے اتنی مسرت دی کہ میں سمجھا کہ شاید دنیا میں مسرت ہی مسرت ہے، غم و اندوہ کا ذرا بھی گذر نہیں ہے — مگر پھر اچانک محبت کا یہ سرچشمہ سوکھ گیا — وہ مر گئی — میری بہن زیبا مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی — وہ کیوں مر گئی — کیوں مر گئی۔؟"

نجمی صاحب نے اس سے اور کچھ نہیں کہا۔ پہلے اپنی انگلیوں سے اس کی آنکھوں کو صاف کیا اور پھر اپنی آنکھوں کے گوشے بھی پونچھنے لگے، اس کے بعد اونی سکارف اس کے گلے کے گرد لپیٹ کر اسے آگے بڑھنے کا اشارہ

کیا اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ خاموشی سے اپنے بنگلے کی طرف چڑھنے لگے۔

یہ اس کی عجیب سی زندگی تھی۔ پھیکی پھیکی سی اور اداس زندگی !۔ اس کے لب تبسم کو ترستے ہی رہتے۔ اپنی اس وقت تک کی زندگی میں اس نے بہتیری ٹھوکریں کھائی تھیں، ان گنت فریب کھائے تھے۔ ان فریبوں کے سہارے اس نے کافی دن تک جی لیا تھا۔ مگر اب یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ جب وہ چار سال کا تھا تو ماں باپ کا سایہ اس کے سر سے اُٹھ گیا۔ زیبا تب دو سال کی تھی۔ بچپن میں ان کی کبھی نہیں بنی۔

وہ کچھ عجیب سی قسمت لے کر پیدا ہوا تھا۔ جس کسی کو محبت سے دیکھتا وہی دامن بچا جاتا۔ ہر آنکھ شعلے اگلنے لگتی۔ اس نے کوثر کو چاہا، سلمیٰ کو محبت طلب نظروں سے دیکھا، سرلا کے ساتھ پہروں رہا مگر کسی نے بھی اُسے اپنے دل کی گہرائیوں سے نہیں چاہا۔ وہ سب اس کی دولت کی پجارن ثابت ہوئیں۔ حالانکہ وہ کوئی ایسا بدصورت بھی نہیں تھا۔ لیکن قسمت اور تقدیر کے آگے کس کی چلی ہے۔؟

اس دل فزا مقام کی رنگین فضائیں بھی اسے راس نہ آئیں۔ اس ماحول میں وہ ایک گھٹن سی محسوس کرنے لگا۔ اسے سکون چاہیئے تھا، ایسا سکون جو اس سے اس کی یادیں چھین لے۔ لیکن اس جنت میں بھی اس کا فقدان تھا۔ اکوسانی آئے ہوئے اسے تین ہفتے ہو چکے تھے۔ یہ مختصر سا عرصہ اسے ایسا لگا تھا جیسے اس نے یہاں صدیاں گذار دی ہوں۔!

شام ہوتے ہی وہ جھیل کے کنارے جا کر بیٹھ جاتا اور گول گول پتھر

اکٹھے کر کے انھیں باری باری جھیل میں پھینکتا جاتا۔ لہریں پیدا ہوتیں ۔۔ ایک دوسرے سے گلے مل کر پھر جدا ہو جاتیں۔ وہ نئے شادی شدہ جوڑوں کو دیکھتا تو اس کا دل کانپ جاتا۔ اس کا جی چاہتا کہ ان کو بد دعا دے ۔۔ ایسی بد دعا جس کے اثر سے وہ دونوں یک لخت جدا ہو جائیں ـــــ یا پھر دونوں کا پیر پھسلے اور وہ گہری جھیل میں جا گریں۔ اوپر سے کوئی پہاڑ کا ٹکڑا ہی گر پڑے اور وہ دونوں اس میں دب کر رہ جائیں۔

لیکن اس نے ایسی دعا کبھی نہیں مانگی۔ زہریلی مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیلتی رہی اور وہ ان جوڑوں کو دیکھتا رہا۔ ساتھ ہی وہ یہ خاموش دعا مانگتا رہا۔

"خدا کرے یہ دونوں ہمیشہ اسی طرح خوش رہیں اور کبھی جدا نہ ہوں۔"

پھر کبھی ایسا ہوتا کہ وہ جھیل میں چلنے والی کسی کشتی کو کرائے پر حاصل کرتا۔ ہاتھ چپو چلا رہے ہوتے اور ذہن دور اپنے وطن میں پرواز کر رہا ہوتا ایک بار زیبا نے اسے آم کھانے کو دیئے تھے مگر اس نے ان آموں کو اس لئے نہیں کھایا تھا کہ اس کے نزدیک وہ آم کھٹے تھے اور میٹھے آم زیبا نے خود اپنے لئے رکھ لئے تھے لیکن درحقیقت ایسا نہیں تھا خواہرانہ محبت کی بے پناہ شدت کے ساتھ زیبا نے کھٹے آم اپنے پاس رکھ لئے تھے اور قدرے میٹھے اسے دے دیئے تھے۔ ساجد اس سے روٹھا رہا تھا اور جب زیبا کو یہ بات معلوم ہوئی تھی تو ایک رات وہ اس کے سرہانے آکر بیٹھ گئی تھی۔ ساجد کے چہرے پر جب سیال انگارے گرنے شروع ہوئے تھے تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا تھا اور پھر حیرت سے روتی ہوئی زیبا کو

دیکھنے لگا تھا۔

زیبا کہہ رہی تھی۔

"بھائی جان آپ ہمیشہ مجھے غلط سمجھتے رہے ہیں۔ آپ مجھ سے اتنی دور بورڈنگ میں رہتے ہوئے بھلا کس طرح جان سکتے ہیں کہ میں اب وہ پہلے جیسی زیبا نہیں رہی ــــ ہمارا ہے ہی کون! امّی اور ابا سب کو بلکتا اور روتا چھوڑ کر کبھی کے چلے گئے۔ آپ ہیں سو مجھ سے ہر وقت برگشتہ رہتے ہیں۔ بھائی جان میں اب بچی نہیں رہی۔ آپ نے کبھی اپنی بہن کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھا۔ میں دنیا میں سب سے بدقسمت لڑکی ہوں جسے کسی کا بھی پیار میسر نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اس کا بھائی بھی اسے قہر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔"

وہ ندامت سے سرنگوں رہا اور وہ اپنے آنسو پونچھتی رہی۔!

اس کے دل پر کسی نے نرم نرم پھائے رکھ دیئے۔ پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ محبت کرنے والی ایک ہستی تو اس کے گھر ہی میں موجود ہے اور وہ اس ہستی کی تلاش میں سالوں تک سرگرداں رہا ــــ کتنی عجیب بات ہے!۔ وہ عورت کی محبت کا متلاشی تھا ــــ یہ محبت اسے مل گئی۔ بیشک اس محبت میں خواہشات شامل نہیں ہیں ــــ لیکن خواہرانہ محبت!

اُف خدایا! ــــ اس کی پاکیزگی میں بھلا کیسے شک ہو سکتا ہے!

تبھی سے وہ اسے بے حد چاہنے لگا تھا ــــ بھرپور چاہت! ــــ زیبا ہی تب اس کی زندگی بن گئی تھی اور اسے یوں محسوس ہوتا تھا گویا وہ محض اسی کی خاطر زندہ ہے!۔

اسے شدت سے زیبا کی کمی کا احساس ہوا۔ اس کی گڑیا جیسی بہن اب اس سے کتنی دور چلی گئی ہے۔ سراب کے پیچھے دوڑ دوڑ کر اس کے قدم تھک

گئے تھے اور جب اس کو محبت کا وسیع سمندر نظر آیا تو اچانک وہ کسی غبار میں روپوش ہو گیا۔

خدایا یہ سب کیا ہے؟ مسرتیں کیا یہاں صرف ہلکی سی ایک جھلک ہی دکھاتی ہیں۔ یہ خوشیاں کیا کسی صورت سے دائمی نہیں ہو سکتیں۔!

جب اسے ہوش آیا تو اس نے محسوس کیا کہ کشتی ساکن ہے۔ چپّو الگ پڑے ہیں اور وہ گردن نیچی کئے بیٹھا ہے۔ لاتعداد کشتیاں اس کے چاروں طرف آکر رک گئی تھیں۔ اور بیشتر آنکھیں سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں!

۳

زیبا کی بے وقت موت سے اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ جیسے اس کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ نجمی صاحب کو جب یہ علم ہوا کہ ان کا واحد رشتہ دار شہر میں بڑی کس مپرسی کے عالم میں دن گذار رہا ہے تو وہ بے چین ہو گئے۔ اس کی خبر گیری کرنے والا اب کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ مختلف لوگوں سے وہ سنتے تھے کہ اسے ہر وقت بخار رہتا ہے۔ نہ اسے اپنے تن کا ہوش ہے اور نہ کھانے کا۔ بال بے تحاشہ بڑھے ہوئے ہیں۔ لباس بھی قاعدے کا نہیں ہے۔ شیو بنائے ہوئے مدتیں گذر جاتی ہیں۔ جب اسے اچانک یہ احساس ہوتا ہے کہ لوگ اسے پہچاننا بند کر دیں گے تو مجبوراً شیو بنا لیتا ہے۔ خوراک بھی بس واجبی سی رہ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جسم بے حد لاغر اور زرد ہے۔

تبھی انھوں نے اُسے زبردستی گوسائیں آنے کے لئے کہا۔ پہلے تو انہوں نے رسمی طور سے کہا۔ لیکن جب اس کے کان پر جوں بھی نہیں رینگی تو مجبوراً نجمی صاحب کو خود وہاں جانا پڑا۔ اس نے بڑے بہانے کئے۔ منتیں کیں، مگر وہ نہیں مانے۔ آخر اُسے وعدہ کرنا ہی پڑا کہ وہ کچھ دن بعد ضرور وہاں پہنچ جائے گا۔

نجمی صاحب اس بڑھاپے میں بھی جوانوں کی سی ہمت رکھتے تھے۔ ہر وقت مسکراتے رہتے تھے۔ کسی نے انہیں غمزدہ نہیں دیکھا تھا۔ انھوں نے دو ہی ہفتوں میں اُسے پورا علاقہ دکھا دیا۔ ساکن اور گہری نیلی جھیل دکھائی۔ پیاری پیاری سی نازک پگڈنڈیاں دکھائیں۔ سب سے اونچی چوٹی پر لے جا کر بے حد حسین غروب آفتاب دکھایا۔ گنگناتے ہوئے جھرنے، رنگ برنگے پرندے اور دل آویز پھول دکھائے۔

لیکن یہ نظارے، یہ برف پوش چوٹیاں، یہ پتھروں کے ڈھیر، سنہری اور چمکیلی آبشاریں اور گہری نیلی جھیل اسے ایک آنکھ نہ بھائی۔ انھیں دیکھ کر وہ اداس ہو جاتا اور اسے وہ ایام یاد آنے لگتے جبکہ وہ زیبا کے ساتھ ایک بار یہاں آیا تھا۔

نجمی صاحب کے ساتھ وہ تقریباً روزانہ ہی پہاڑ کی بلندیوں تک جایا کرتا تھا۔ آیا تھا غموں کا مداوا کرنے لیکن دل کے زخم کسی صورت سے مندمل نہیں ہوئے۔ اس کی زندگی مسلسل درد و کرب کا نام بن کر رہ گئی تھی۔ بعض دفعہ وہ سوچتا کہ کیا میرے قلب کو مسرت نصیب نہ ہو گی۔ کیا وہ کبھی مسرور نہیں ہو سکے گا ــــ؟

نہیں ہرگز نہیں ــــ ٹھنڈی یخ بستہ ہوائیں اونچے درختوں سے

ٹکرا کر جواب دے دیتیں اور وہ سر جھکا کر پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔

نجمی صاحب کی باتوں نے اس کی کافی ڈھارس بندھا رکھی تھی۔ ان کا وجود اس کے لئے کسی فرشتے سے ہرگز کم نہ تھا۔ ساجد پر جب شوریدہ سری کا حملہ ہوتا تو وہ پھر کر اس سے کہتے۔

" مجھے دیکھو میں کتنا بوڑھا ہو گیا ہوں۔ جسم میں جان نہیں رہی ہے مگر پھر بھی اسے گھسیٹ رہا ہوں اور غموں سے برابر ٹکرا رہا ہوں تمہاری عمر کم ہے۔ لہٰذا تم نے غم بھی کم اٹھائے ہیں۔ میری عمر زیادہ ہے اور میں ان کے انبار تلے دبا ہوا ہوں۔ لیکن میرے پاس خوش ہونے کے اس قدر ذرائع ہیں کہ میں غمگین نہیں ہوتا۔ میری عمر گذشتہ کی داستانیں، یہ حسین خطہ، یہ ماحول، چاندنی راتیں، خوشبو، مہک اور رعنائیاں ـــ انھوں نے مجھے کبھی غمزدہ نہیں ہونے دیا۔ جانتے ہو کہ غم کا روگ لگا کر کیا ملے گا؟ ـــ ہم خاموشی سے اس جہاں سے چلے جائیں گے اور قدرت کی ان گنت نعمتیں کف افسوس ملتی رہ جائیں گی۔ زندگی خدا کی دی ہوئی نعمت ہے، ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیئے نہ کہ اسے جان بوجھ کر موت کے حوالے کر دیں ـــ خدا کی سب سے بڑی عبادت یہی ہے کہ ہم اس کی بخشی ہوئی چیزوں کا شکریہ ادا کریں ـــ زندگی بھی اس کا ایک عطیہ ہے ـــ غم تو ہماری زندگی پہ حملہ کرتے ہیں۔ تمہیں دنیا میں ابھی بہت کچھ کرنا ہے لہٰذا غموں سے دور رہو۔ خبردار جو تم نے مجھے جھیل میں کود جانے کی دھمکی دی ـــ اگر تم نے ایسا کیا تو یقین مانو میں بھی کسی سے پیچھے رہنے والا نہیں ہوں ـــ

تم اپنے بوڑھے چچا کو ہمیشہ تیار پاؤ گے ۔"

نجمی صاحب کی یہ باتیں اُس میں جوش اور ہمت پیدا کر دیتیں۔ باتیں کیا تھیں دراصل موتی تھے جو ان کے لبوں سے جھڑتے تھے۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ واقعی اب تک وہ محض ایک ذرا سی بات کے لئے اتنا پریشان رہا ہے۔ دنیا میں اور بھی بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جنہیں اُس سے بھی زیادہ غم ہوں گے!

وہ کیا کر رہا ہے؟ غموں سے ڈرتا ہے! کیا یہ بزدلی نہیں ہے!

وہ خود پر لعنت بھیجتا اور قسم کھاتا کہ اگلے طلوع آفتاب کے وقت خوش و خرم بستر سے اُٹھے گا۔ لیکن یادِ ماضی ---؟

یہ کسی کو چین لینے دیتی ہے بھلا!۔

جب پرانی باتیں یاد آجاتیں تو خود سے کئے ہوئے وعدوں اور قسموں پر جیسے اوس پڑ جاتی اور وہ پھر مضطرب ہو جاتا۔!

زندگی جس طرح گذر رہی تھی گذرتی رہی۔ وہ چپ چاپ ایسی شاہراہ پر چلتا رہا جس پر خار دار سنگریزے تھے۔ سنگریزے جو بار بار سدِ راہ بن جاتے تھے۔ ویسے پہلے کے مقابلے میں اُس میں تغیر ضرور ہوا تھا۔ اس کی شوریدہ سری نجمی صاحب کی پر لطف باتوں سے ایک حد تک کم ضرور ہو گئی تھی۔ اپنے لباس کا خیال بھی رکھنے لگا تھا اور روزانہ صبح و شام جھیل کے کنارے چہل قدمی بھی کرنے لگا تھا۔

جھیل کا سیمابی پانی جس سڑک کو رہ رہ کر چومتا تھا، وہ سڑک اسے بہت پسند تھی --- بالکل خنک سڑک --- ننھے ننھے پھولوں سے ڈھکی ہوئی سڑک --- پھول، جو کاسنی رنگ کے تھے --- اودے نیلے تھے۔ اِن

ان پھولوں پر ہرجائی تتلیاں محوِ پرواز رہتیں اور ہوا کے گستاخ جھونکے بار بار ان سے چھیڑ خانی کرتے تھے۔

سڑک پر چلتے چلتے کبھی اس کی مڈبھیڑ کسی نووارد لڑکی سے بھی ہو جاتی یہ لڑکیاں بھی اپنے جلتے ہوئے دلوں کو ٹھنڈک پہنچانے یہاں آتی تھیں۔ ہلکی سی گلابی رنگت والی لڑکیاں جو سردی کے باوجود اپنے نازک جسموں پر کچھ لپیٹنے کو عار سمجھتی تھیں۔

اِن لڑکیوں نے اسے بھی بار بار دیکھا تھا۔ کئی بار دانستہ اپنے مرمریں جسموں کو اس سے مس کر کے چل دی تھیں۔ محض یہ دیکھنے کے لیے کہ مٹی کے اس بت میں ابھی جان پڑی یا نہیں ـــــ ہاں وہ ان سے بچ کر اس طرح چلا جاتا گویا ان کے اجسام میں جہنم کی آگ بھری ہو۔ اگر وہ ذرا سا بھی قریب گیا تو جل جائے گا!

اُسے ایسی لڑکیاں ہرگز پسند نہیں تھیں جو خود دعوت نظارہ دیں۔ ان میں نسوانی حیا نام کو نہ تھی۔ مزا تو اس وقت آتا ہے جبکہ نوجوان خود ان تتلیوں کا تعاقب کریں اور شرم و حیا کی ہزاروں منزلوں سے گزرنے کے بعد پھر وہ انھیں ایک نظر دیکھیں۔

اس کی نظروں میں لڑکی کی صحیح تعریف یہی تھی!

وہ محبت کیا جس نے کبھی نا امیدی اور یاس کا مونہہ نہ دیکھا ہو! ـــــ نا امیدی کے بعد جو چاہت ملتی ہے دراصل ہزاروں سال کی طویل زندگی سے بہتر ہوتی ہے۔

ایک لمحہ کی محبت صدیوں پرانے انتظار کا نعم البدل بھی کہی جا سکتی ہے!

ساجد بھی دراصل ایسی ہی محبت کا متلاشی تھا۔ محبت جس میں ہلکی ہلکی آنچ ہو، محبت جو نیزے کی انی کی طرح دل میں کھبتی چلی جائے — محبت، جس میں آنکھیں پانی بہاتے بہاتے سوکھ جائیں — وہ چاہتا تھا کہ کوئی اسے اتنی شدت سے چاہے کہ اسے اس چاہت سے وحشت ہونے لگے۔

اور پھر ہوا بھی ایسے ہی۔ کسی کی بے پایاں محبت نے اُسے بڑھ کر اپنی آغوش میں اِس طرح لیا کہ اُسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی!

۴

کالجوں کی چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ کیونکہ وہ تعلیم کو کبھی کا خیرباد کہہ چکا تھا۔ لہٰذا منتظر تھا کہ اس کا عزیز ترین دوست محبوب کب اس سے آکر ملتا ہے؟ اچھا خاصا معقول آدمی تھا یہ محبوب۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ کسی انسان میں کوئی نہ کوئی رگ ضرور زیادہ ہوتی ہے تو غالباً وہ انھیں محبوب صاحب کے لئے کہا گیا ہوگا۔ دراصل وہ تھا تو نہیں لیکن خود کو ہمہ صفت انسان سمجھنے پر مُصر تھا۔ دنیا کا کوئی کام ایسا نہ تھا جو نہ کر سکتا ہو (اپنی دانست میں)۔ مختلف فنون کا اُس پر دورہ پڑتا تھا۔ آج اگر کوئی کام کر رہا ہے تو اگلے ہفتے بالکل نئے کام کا آغاز کر دے گا جب اُس سے طبیعت اکتا جائے گی تو پھر کوئی اور — اور پھر کوئی اور!

حاصل مطلب یہ کہ جب بنگلے میں اس کا نزول ہوا۔ تو وہ افسانہ نگاری تج چکا تھا اور شاعری کے جراثیم اس کے اندر حلول کر گئے تھے۔

اچھا خاصا نام تھا سید محبوب علی، مگر اب وہ محبوب علی مجذوب بن چکا تھا۔ خدا کی قدرت ہے۔ اسے انسان کو پلٹنے میں کیا دیر لگتی ہے!

سامان ڈرائنگ روم میں رکھنے کے بعد وہ دبے پاؤں ساجد کی طرف بڑھا جو اس وقت غسلخانے میں سے نکل کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوا بال سکھا رہا تھا اور ساتھ ہی ایک شعر بھی گنگناتا جا رہا تھا ؎

محبت کی نگاہوں سے کسی کو تم اگر دیکھو ——— مصرع ثانی اسے غالباً یاد نہیں آ رہا تھا۔ لہٰذا پہلے مصرعے کو وہ بار بار دہرا رہا تھا۔ محبوب نے اس کی پشت پر پہنچ کر تقریباً چیخ کر کہا۔

"تو عبرت کی نظر سے پہلے مجھ کو دیکھ کر دیکھو ——— تسلیم عرض ہے۔"

"ارے گاڈ دی تم کب آئے ———؟" ساجد مسرت سے جھوم جھوم اٹھا۔

"بس ابھی آیا ——— کیسے آیا، یہ پھر بتلاؤں گا۔"

"مگر صرف یہی سامان ہے تمہارا ———؟" ساجد نے اس کی اکلوتی اٹیچی کو دیکھ کر پوچھا۔

"سامان چند دنوں کا ہے پھر کی خبر نہیں۔" حسب عادت اس نے فی البدیہہ ایک مصرع عرض کرتے ہوئے کہا۔ "کیوں خبر نہیں ——— یہ پھر بتلاؤں گا؟"

"مگر بھائی یہ صرف چند کپڑے ———!"

"بعد میں تمہارے کپڑے استعمال کر لوں گا اور کیا ———؟"

"مطلب یہ کہ تم میرے کپڑوں کا ستیاناس کرنے آ گئے ہو۔"

"یہی سمجھ لو ——— مگر تمہارے کپڑے اچھے بھی کہاں ہوتے ہیں۔ پہلے ہی ستیاناسی قسم کا لباس پہنے پھرتے ہو ——— اچھا، ویسے یہ تو بتاؤ کہ کیا تم

کچھ گھن چکر قسم کے انسان بن کر رہ گئے ہو!"

"— ہاں، میرا کہیں دل نہیں لگتا—" ساجد نے مضمحل انداز میں جواب دیا۔

"نہیں لگتا تو لگاؤ— اس طرح کام تھوڑی ہی چلے گا۔"

"باغ میں لگتا نہیں صحرا سے گھبراتا ہے جی   اب کہاں لے جا کے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم"

"خوب اچھا شعر پڑھا ہے۔ مگر بھائی اب تم لے کر آ تو گئے ہو اسے کوسانی میں اور تمہیں کیا چاہیئے؟"

"میں زیبا کو کسی بھی طرح نہیں بھلا سکتا محبوب۔"

"کوشش کرتے رہو، کسی نہ کسی دن بھول ہی جاؤ گے۔ دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ مرنے والوں کے ساتھ خود نہیں مرا جاتا— کیوں نہیں مرا جاتا؟— یہ میں پھر بتلاؤں گا۔"

"چچا نجمی میری بڑی دلجوئی کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ میرا غم غلط ہو جائے—"

"کیوں نہیں ہو گا بھئی— دیکھ لینا ایک دن ایسا ضرور ہو گا۔"

نجمی صاحب کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولے اور محبوب کو دیکھ کر اچانک ٹھٹھک گئے۔ اس کی ہیئتِ کذائی سے چند لمحے تک محظوظ ہوتے رہے اور پھر مسکرا کر بولے۔

"تم کب آئے محبوب— اچھے تو ہو؟"

"کہاں اچھا ہوں جناب— اتفاق سے شاعر بن گیا ہوں۔ کیوں بن گیا ہوں؟— یہ میں آپ کو پھر بتلاؤں گا۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ شاعر تو معاشرے میں بڑی قدر کی نگاہ سے

دیکھے جاتے ہیں۔"

"بشرطیکہ وہ شاعر ہوں" ساجد نے لقمہ دیا۔

"ابھی دیکھنا تمہیں کیا کیا پھڑک دار چیزیں سناتا ہوں۔ پسند نہ آئیں تو مجذوب نہیں گدھا کہہ دینا۔ ہاں۔"

"کہہ کیا دینا۔ وہ تو تم اب بھی ہو؟" ساجد نے ہنس کر کہا۔

"مگر بھئی یہ مجذوب کیا چیز ہے؟" نجمی صاحب نے پوچھا۔

"جی اسے میرا تخلص کہتے ہیں۔" محبوب شرما کر بولا "آپ کو محبوب کے ساتھ مجذوب اچھا نہیں لگتا؟"

"بہت اچھا لگتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تم اپنا نام مجذوب ہی رکھ لو۔ تمہارے حلیہ پر یہ چپتا بھی خوب ہے۔"

محبوب کچھ دیر تک گردن نیچی کئے انکساری سے ہنستا رہا اور پھر بولا۔

"آپ سے خوب ملاقات ہوتی۔ پچھلے سال جب میں یہاں آیا تھا تو بدقسمتی سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی — کیوں نہیں ہو سکی تھی؟ یہ میں آپ کو پھر بتلاؤں گا۔"

"وہ تمھاری بدقسمتی بیشک تھی، لیکن میری خوش قسمتی تھی —" نجمی صاحب ہنس کر بولے۔

ساجد نے بھی ان قہقہوں میں حصہ لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک لمحہ کے لئے تو وہ یہ بھی بھول گیا کہ گذشتہ دنوں میں وہ بے حد غمزدہ رہا ہے۔ ہلکا سا ایک تبسم اس کے خزاں رسیدہ لبوں پر وہی مسیحائی کر گیا جو پژمردہ گلوں پر شبنم کر جاتی ہے!

محبوب کی آمد نے بھی درسائنس اسے کافی مسرت دی تھی۔ نجمی صاحب

بھی پر امید تھے کہ اب وہ غمزدہ نہ ہو سکے گا۔ محبوب بھی اسے ہنساتا رہیگا
اور وہ خود بھی اسکی کوشش کرتے رہیں گے۔
کاش!۔۔۔ کسی طرح وہ ایّام گذشتہ کو بھول جائے!
پھر ایک دن محبوب نے پہاڑی اُلّو دیکھ لیا۔ حالانکہ آبئیے میں وہ
روزانہ اُلّو دیکھا کرتا تھا۔ مگر یہ پہاڑی اُلّو!۔۔۔ یہ تو بے حد حیرت انگیز
چیز تھی۔ بڑی دیر تک وہ اُلّو کا قافیہ سوچتا رہا اور جب سوچتے سوچتے
خود اس کا قافیہ تنگ ہو گیا تو اس نے ایک آزاد نظم کہنے کی ٹھان لی۔
ایسی نظم جس میں اُلّو کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا ہو۔
جب اپنا خیال اس نے ساجد پر ظاہر کیا تو وہ اکتائے ہوئے لہجے
میں بولا۔
"آخر اس کا فائدہ بھی کیا ہے۔۔۔ ہم تمہیں دیکھ لیں گے اور سمجھ لیں گے
کہ ہم نے اُلّو پر نظم سن لی۔۔۔"
"وہ تو ٹھیک ہے" مجذوب نے کہا۔ "لیکن یار تمہیں معلوم ہی
ہے کہ اپنا ملک اب آزاد ہو چکا ہے، ہم آزاد ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ہماری
شاعری بھی قافیہ اور ردیف کی قید سے نکل کر آزاد ہونی چاہیئے۔۔۔
کیوں ہونی چاہیئے؟ یہ میں پھر کبھی بتلاؤں گا۔"
"تمہاری مرضی۔۔۔" ساجد نے بیزاری سے جواب دیا۔
"مگر فی الحال یہ سن لو کہ میں اِسی وقت سے آزاد شاعر بن گیا ہوں
اور رات کو تمہیں اپنی نظم ضرور سناؤں گا۔"
"کیوں سناؤ گے اور یہ بات تم مجھے کب بتلاؤ گے؟" ساجد نے
جل کر اس کی نقل اتاری۔

"بتلاؤں گا ضرور بتلاؤں گا۔ مگر کب بتاؤں گا، یہ میں تمہیں پھر کبھی بتلاؤں گا۔"

اتنا کہہ کر وہ باغیچے میں نظم کہنے چلا گیا اور ساجد اسے جاتے دیکھتا رہا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہلکا سا تبسم اس وقت اس کے لبوں پر کھیل رہا تھا ۔ تبسم، جس کی تلاش میں وہ ان بلندیوں تک آیا تھا، اب نہایت آسانی سے اس کے لبوں پر آجاتا تھا۔

صبح سے شام ہو گئی مگر محبوب باغیچے کے اندر ہی موجود رہا۔ رات کو جب وہ ڈائننگ روم میں آیا تو اس کا سینہ فخر سے تنا ہوا تھا، نتھنیں کھلی ہوئی تھیں اور آنکھیں غرور کے باعث نیم وا سی تھیں۔ نجمی صاحب کو علم ہو چکا تھا کہ آج مجذوب اپنا کلام سنائے گا۔ لہٰذا وہ اپنے کانوں میں پہلے ہی سے روئی ٹھونس کر آئے تھے۔ اتفاق سے محبوب کی نظر ان کے کانوں پر پڑ گئی اور اس نے جب روئی کانوں میں دینے کی وجہ دریافت کی تو نجمی صاحب نے محض مختصر سا جواب دیا۔

"عطر کا پھویا ہے۔"

اور محبوب مطمئن ہو گیا۔ پھر اس نے ایک شانِ بے نیازی سے جیب میں سے تہہ کیا ہوا ایک کاغذ نکالا اور اجازت کے بغیر ہی شروع ہو گیا۔

"عرض کرتا ہوں ۔ دیکھو یار ساجد کیا عرض کر رہا ہوں ۔ یعنی تم داد دیئے بغیر نہ رہو گے۔ ہاں تو عرض کرتا ہوں ۔"

اس کے بعد اس نے نظم عرض کی جسے ساجد کڑوے گھونٹ کی مانند نگلتا رہا اور نجمی صاحب خاموش بیٹھے رہے۔ نظم یہ تھی۔

میری محبوب، میری جان سے پیاری محبوب!
کیا ستم تم نے کیا، چھوڑ گئیں جو مجھ کو
میں پریشان سا افسردہ سا
ٹھنڈ پہ بیٹھا ہوں کہ تنہائی مجھے بھاتی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ
تنہائی کی خواہش تو اسے ہوتی ہے

وہ
کہ آنکھوں کو کئے بند جو راتوں کو کسی ٹہنی پر
ایک قنوطی کی طرح
ہائے دنیا سے اور ان دنیا کے ہنگاموں سے
اپنے خیالوں میں سجائے ہوئے دنیا اپنی، بیٹھا رہتا ہے فسردہ سا درماندہ سا
لوگ کہتے ہیں
وہ ذی ہوش محض اُلّو ہے
سوچتا ہوں کہ میری بھی تو یہی حالت ہے
میں بھی کیا اُلّو ہوں؟

۵

نظم ختم ہو گئی اور ساجد ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا۔ وہ داد طلب انداز میں ساجد کو اور رنجبی صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر برستی ہوئی یتیمی چیخ چیخ کر اس کے الو ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔ وہ داد پاتے

کے لئے بیقرار تھا کہ اچانک نجمی صاحب کا ایک فقرہ لطف دے گیا۔ انھوں نے کانوں میں سے روئی نکالتے ہوئے کہا۔

"بھئی محبوب تم اپنی نظم سنانے کو کہہ رہے تھے۔ سناؤ نا"

ساجد اتنا ہنسا اتنا ہنسا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور محبوب ناراض ہونے کی بجائے خود بھی ان قہقہوں میں شامل ہوگیا اور پھر اس کا ساتھ نجمی صاحب نے بھی دیا۔

ناشتہ کے بعد تینوں بنگلے سے باہر نکل آئے۔ آج خلاف معمول وہ کافی جاذب نظر دکھائی دے رہا تھا۔ گلے میں گلابی اسکارف تھا اور بال بھی سلیقے سے آراستہ کر گئے تھے۔ نجمی صاحب اسے دیکھ کر بولے۔

"دیکھا، چند قہقہوں نے تمھیں کتنا بدل دیا ہے —— تم اب خود اپنا خیال رکھنے لگے ہو —"

فلیٹ کے نزدیک جو اسکیٹنگ ہال تھا نجمی صاحب اسے گھسیٹ کر اس کے اندر لے جانے لگے اس نے اعتراض کیا تو انھوں نے جواب دیا۔

"تم کھڑے دیکھتے رہنا میں اسکیٹنگ کروں گا!"

"آپ!"

"ہاں کیوں — کیا ہوا جو میں بوڑھا ہوں، مگر میرا دل تو جوان ہے بیٹے — اور پھر وہاں لڑکیاں بھی تو پیروں میں پہیے لگائے ادھر ادھر دوڑتی پھرتی ہیں۔ اب کیا میں لڑکیوں سے بھی گیا گذرا ہو گیا؟"

"معاف کیجئے گا، مجھے تو آن میں اور آپ میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آتا"

محبوب نے ہونٹ بھینچ کر کہا تھا مگر نجمی صاحب نے سن ہی لیا۔

"اچھا بول لیتے ہو برخوردار۔ یہی وجہ تو ہے کہ میں تمھیں بھی اپنا جیسا

ہی سمجھتا ہوں۔"

خوب قہقہے لگے۔ ایسے بلند و بانگ قہقہے کہ راہ گیر مڑ مڑ کر انھیں دیکھتے رہے ہال کے اندر گلشن کھلا ہوا تھا۔ رنگ برنگے پھول اور کلیاں ہر سمت تیرتی پھر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ یا ہوا کے دوش پر چل رہی ہوں۔ بیشتر کلیاں پھولوں سے چمٹی ہوئی تھیں۔ ڈر تھا کہ مبادا گر جائیں اور ایسا ہو بھی رہا تھا۔ بار بار کوئی نہ کوئی اپنا توازن قائم نہ رکھتے ہوئے گر پڑتا۔ لڑکی گرتی تو اسے اٹھانے سب دوڑتے اور جب کوئی نوجوان زمین بوس ہوتا تو سب اس کا مذاق اڑانے لگتے۔

نجمی صاحب نے زبردستی اس کے پیروں میں پہیے والے جوتے پہنا دیئے محبوب نے بھی تقلید کی مگر جب ساجد نے نجمی صاحب کے پیر کی طرف ہاتھ بڑھائے تو وہ ہنس کر بولے۔

" اماں کون مسخرہ پھسلنا جانتا ہے۔ وہ تو تمہیں اس جگہ لانے کا بہانا تھا۔"

وہ انھیں شکوہ بھری نظروں سے دیکھ کر ہنس دیا۔ جھینپی ہوئی ہنسی۔!
" آپ نے زبردستی کی ہے۔ یقین مانیئے مجھے پھسلنا نہیں آتا۔"
" تم بھی نرے احمق ہو۔" نجمی صاحب نے مصنوعی غصّے سے کہا۔" اماں لڑکیوں کو دیکھ کر تو اچھے اچھے پھسل جاتے ہیں۔ اٹھو اور کوشش کرو۔"
محبوب نے بھی جلدی جلدی گردن اثبات میں ہلا کر نجمی صاحب کی تائید کی اور پھر اسے بازو سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ جلد ہی وہ دونوں لکڑی کے فرش پر چارلی چیپلن کے انداز میں اٹھنے اور گرنے کی مشق کر رہے تھے۔!
ہر بار ایسا ہوتا کہ وہ کسی نہ کسی سے ٹکرا جاتا اس نے تو خیر توازن قائم

بھی لیا تھا لیکن محبوب نے جب خواتین پر ایک نظر ڈالی کر چیک فارم بڑھنا چاہا تو ٹانگیں افقی سمت میں چر گئیں اور وہ دھب سے فرش پر آرہا۔ جھینپنے کی بجائے وہ خود ہی ہنس پڑا۔ ایسا نہ کرتا تو پھر دوسرے اس پر ہنستے۔

ساجد دوسروں کو دیکھ دیکھ کر پھسل رہا تھا۔ جہاں نظر چوکتی اور پیر غلط پڑتے تو وہ ڈگمگاتا اور اس ڈر سے کہ کہیں وہ گر نہ جائے جلدی سے قریب سے گذرنے والے کسی بھی فرد کو پکڑ لیتا۔ ایک بار جب اس نے ایسا کیا تو اچانک وہ ساتھی کو پکڑتے ہوئے نیچے گرا۔ اُسے محسوس ہوا کہ زمین یکایک نرم ہو گئی ہے ــــ انتہائی گداز اور معطّر۔

"اوہ ۔ میں معافی چاہتا ہوں ــــ" اُس نے بے اختیار اٹھنے کی کوشش کی۔

"ہائے آپ نے تو مجھے مار ہی ڈالا تھا!" نقرئی گھنٹیوں والی ایک آواز۔

"میں پھر معافی مانگتا ہوں ــــ" اُسے اُٹھانے کے لئے ساجد نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

"کوئی بات نہیں ــــ" اس نے اسکیٹنگ صندلی پیروں میں سے کھول لئے اور پھر کھڑی ہو گئی۔ محبوب درحقیقت مجذوب بنا ہوا اسے حیرت سے موہنہ پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ ساجد نے جب اس پھولوں کی نازک سی شاخ کو اٹھایا تو وہ پھر لچک گئی اور محبوب اُسے دوبارہ گرنے سے بچانے کے لئے آگے بڑھا۔

"شکریہ! اب میں ٹھیک ہوں ۔" اس نے محبوب کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔

"آپ بھی غالباً سیکھ رہی ہیں؟" اس نے شرمندگی مٹانے کی خاطر

گفتگو کا آغاز کیا۔

"جی ہاں —" بڑی ہی مترنم آواز میں جواب آیا۔

"اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں روزانہ آپ کو سکھا سکتا ہوں —"

"میں کچھ دیر پہلے آپ کے سرکس کے کمال دیکھ چکی ہوں —" اشارہ محبوب کے قلابازی کھا کر گرنے کی طرف تھا۔

"جی وہ تو — وہ تو —" ایسے جواب ہی بن نہ پڑا۔

نجمی صاحب ایک کنارے پر کھڑے ہوئے ان دونوں کی حماقتوں سے محظوظ ہو رہے تھے اور جب انھوں نے ایک مجسم بہار کو ان سے مخاطب پایا تو وہ خود بھی لپک کر آگے بڑھے۔

"کیا ہوا — کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں چچا — میں ذرا گر گیا تھا۔" ساجد نے جھینپے ہوئے انداز میں کہا۔

"اور گرے بھی تو ان محترمہ کو ساتھ لے کر —" محبوب نے لقمہ دیا۔

"کوئی بات نہیں — میں نے تو فیل نہیں کیا —" وہی گھنٹیاں!

"آپ میرے بزرگ اور میرے چچا ہیں —" ساجد نے تعارف کرایا۔

"آپ سے مل کر بیحد مسرت ہوئی —"

"مجھ سے مل کر یا اِس سے ٹکرا کر —" نجمی صاحب نے ساجد کی طرف اشارہ کیا اور پھر نازک سی شاخ کو لچکتے دیکھ کر جلدی سے بولے۔ "اِس نے مجھے چچا کہا ہے وہ درست ہے۔ مگر بیٹی میں بوڑھا ہرگز نہیں ہوں — تین سو فٹ اونچے اپنے بنگلے پر پیدل چلے جانے والے شخص کو کیا تم بوڑھا سمجھ سکتی ہو؟"

"جی ہرگز نہیں ــــ"

"میں بھی نہیں سمجھتا ــــ کیوں نہیں سمجھتا، یہ میں پھر کبھی بتلاؤں گا۔"

"تم بیچ میں مت ٹپکا کرو جی ــــ" نجمی صاحب نے محبوب کو سرزنش کی۔

"آپ حضرات کیا کوسانی ہی میں مقیم ہیں؟" کٹورے جیسی آنکھوں پر یہ سوال پوچھتے ہی پلکوں کی چلمن آ گری۔

"ہاں ــــ میں یہیں رہتا ہوں اور یہ دونوں نیچے سے یہاں آئے ہیں۔"

"یہ تو آپ ہماری بے عزتی کر رہے ہیں۔" محبوب بولا۔ "اگر ایسا ہی ہے تو میں آپ کے بنگلے سے ایک ہزار فٹ اوپر اپنا ایک بنگلہ بنوا کر آپ کو وہاں آنے کی دعوت دوں گا تاکہ میں بھی یہ کہہ سکوں کہ میں تو اوپر رہتا اور نجمی صاحب نیچے سے آئے ہیں ــــ"

سب کھکھلا کر ہنس پڑے اور نازک سے دہن میں موتیوں کی لڑی نمایاں ہو گئی۔ سیب ایسے گالوں میں گڑھے پڑ گئے اور ساجد بے اختیار اُن ننھے ننھے گڑھوں کو دیکھنے لگا۔

"تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا ــــ" گفتگو کا مکمل فرض نجمی صاحب ہی انجام دے رہے تھے۔

"میں کشور ہوں ــــ کالج کی تعطیلات میں یہاں آئی ہوں۔ میری چند سہیلیاں بھی میرے ساتھ ہیں۔"

"آپ کی سہیلیاں!" محبوب نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "کہاں ہیں وہ ــــ اُن سے ضرور ملوایئے ــــ"

ساجد نے گھور کر اسے دیکھا اور محبوب جلدی سے نگاہیں چرا گیا۔

"تم سب ٹھہری کہاں ہو —؟" نجمی صاحب نے پھر پوچھا۔
"میرے بھائی صاحب یہاں انجینئر ہیں۔ ان کی کوٹھی میں مقیم ہوں۔"
وہ بولتی رہی اور ساجد دو ننھے منے لبوں کو تبسم ریز دیکھتا رہا۔
وہ بار بار دزدیدہ نظروں سے اُسے دیکھتا اور پھر اسے اپنی ہی طرف دیکھتے ہوئے پاتا۔ محبوب الگ ریشہ خطمی ہوا جا رہا تھا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ اسے اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دے ڈالے۔ وہ لگاتار مسکرا رہی تھی۔ نوخیز کلیوں والی مسکراہٹ اور ساجد خاموشی سے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔
"غالباً آپ ابھی تک شرمندہ ہیں!" اس نے ساجد کو خاموش دیکھ کر پوچھا۔
"ہاں اس کی عادت ایسی ہی ہے۔" ساجد کی بجائے نجمی صاحب نے جواب دیا — "مگر بیٹی تم یہ مت سمجھ لینا کہ یہ گونگا ہو گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ خدا نظرِ بد سے بچائے تم بہت خوبصورت ہو اور یہ شخص دنیا کی ہر خوبصورت چیز سے دور بھاگتا ہے —"
"اچھا —!" اس نے بڑی بڑی نظریں اُٹھا کر حیرت سے ساجد کو دیکھا۔ "پھر تو انھیں یہ خوبصورت مقام بھی پسند نہیں آیا ہو گا —"
"اب آ جائے گا — تم ملتی رہو گی نا —"
"جی ہاں جی ہاں — کیوں نہیں —" کشور کی بجائے محبوب نے جواب دیا۔ ساجد خاموش رہا۔ وہ جوتے کی نوک سے فرش کو کرید رہا تھا۔
ہوا کے معطر جھونکے اُسے اپنے ساتھ لے کر چلے گئے تو پھر وہ تینوں ہال سے نکل کر باہر آ گئے۔ سرمئی بادلوں کی ٹولیاں پہاڑوں پر نثار ہونے کے لیے دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھیں۔ ایک جانفزا اندھیرا پورے

علاقے پر حاوی ہوتا جارہا تھا۔ ساجد کو آج کا موسم بیحد پسند آیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ فضا میں ابھی تک کِشور کے مُعطّر بالوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی!

جب نجمی صاحب اپنے بنگلے کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چڑھنے لگے تو اُسے خاموش پاکر کہنے لگے۔

"عجیب چیز ہو تم! — اتنی اچھی لڑکی سے روٹھے کھڑے رہے۔ خدا نے یہ زبان کس لئے دی ہے۔ بھئی اتنی معصوم لڑکی میں نے کبھی نہیں دیکھی۔"

"میں نے بھی نہیں دیکھی۔ بلکہ دیکھا جائے تو کسی لڑکی کو اتنے قریب سے آج میں نے پہلی بار دیکھا ہے — کیوں دیکھا ہے — یہ میں ....."

"تم ذرا کم بکواس کیا کرو مجذوب —" نجمی صاحب کی بھنویں تن گئیں۔ چند قدم تک وہ اسی انداز میں چلتے رہے۔ محبوب تو شرمندہ ہو کر سب سے پیچھے چلنے لگا تھا۔ البتہ وہ ابھی تک ان کے پہلو میں چل رہا تھا۔ تبسم کی ہلکی سی لکیر اُس کے لبوں سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔

"ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا" نجمی صاحب نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "کہ اب تم اس کے ہاں جانا شروع کردو۔ دیکھ لینا ایک دن ایسا آجائے گا۔ جبکہ یہ تمہارے پہلو بہ پہلو چلے گی اور دوسرے جلیں گے۔ تم جیسا خوش قسمت انسان اور کون ہوگا؟ مجھے ڈر تو یہ ہے کہ ان تمام پھولوں کا رنگ اُسکا حسن دیکھ کر کہیں ماند نہ پڑ جائے اور تتلیاں گلوں کو چھوڑ کر اس کا تعاقب نہ شروع کردیں۔ تم مسکرا رہے ہو نا۔ شاباش —"

"مجھے اِس موقع پر اپنا ایک شعر یاد آرہا ہے" محبوب پھر ٹپک پڑا ــــ "عرض کرتا ہوں۔

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کُشا ہوئے کہ نہ جانے کیا بنا دیا"

"لاحول ولا قوۃ!" نجمی صاحب رک کر اُسے گھورنے لگے اور ساجد دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔ "نہ جانے کس احمق نے اس شخص کو صلاح دے دی ہے کہ وہ دوسروں کے اشعار اپنے کہہ کر سنائے اور اس طرح سنائے کے ان کی ریڑھ مار کر رکھدے ــــ نہ جانے کیا بنا دیا؟ ہونہہ لاحول"

"یوں لب کُشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا" ساجد نے تصحیح کر دی۔

"بالکل بالکل ــــ بالکل اِسی طرح کہا تھا میں نے ــــ کیوں کہا تھا یہ میں پھر بتلاؤں گا"

"بھائی ہمیں بالکل فرصت نہیں ہے کہ اس قسم کی لغویات بعد میں بھی سنیں ــــ" نجمی صاحب اکتا کر بولے۔ "ویسے میں تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں کہ تم کو اگر ہمارے ساتھ رہنا ہے تو آدمی کی طرح رہو ــــ یوں بندروں کی طرح ہر وقت کھی کھی کھی کھی کرنا مجھے پسند نہیں ــــ اور کیوں پسند نہیں یہ میں تمہیں پھر کبھی نہیں بلکہ اسی وقت بتلا دیتا ہوں! کہ ایسے لوگ میری چڑ ہیں ــــ سمجھے ــــ؟"

"آپ ناراض نہ ہوں ــــ" ساجد نے ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ــــ "میں محبوب کو بعد میں سمجھا دوں گا۔ یہ بیچارہ اپنی عادت سے مجبور ہے ــــ"

"مگر صاحب زادے مجھے بھی ایک بری عادت ہے کہ بلا وجہ میرا ہاتھ

دوسروں پر اٹھ جاتا ہے۔"
ساجد بری طرح ہنسنے لگا اور پھر محبوب کو ساتھ لے کر بنگلے کے دوسری طرف چلا گیا۔

۶

پھر ایک دن نجمی صاحب نے معلوم کر ہی لیا کہ کشور کون سی کوٹھی میں مقیم ہے۔ جب وہ ہانپتے کانپتے ساجد کے پاس ڈرائنگ روم میں آئے تو ان کے ہاتھوں میں سیاہ کھجوروں کے چند پیکٹ تھے۔
"یہ کھجوریں ریاض کی ہیں۔ بصرہ سے تو گڑ کے مزے کی کھجوریں آتی ہیں میں بغیر گٹھلی کی لایا ہوں ۔"
"مگر اتنی ساری ۔؟"
"تم انھیں لے کر کشور کے پاس جاؤ گے اور کہو گے کہ تمہارے تایا کے بھائی کے خسر سعودی عرب سے لائے تھے اور تم اب اس کے لئے لے کر آئے ہو ۔ کیوں تمہارے لئے راہ ہموار ہو گئی ہے نا ۔"
وہ کھل کر ہنسا ۔ بہت دیر تک ہنستا رہا اور نجمی صاحب اسے ہنستے دیکھ کر ہنستے رہے ۔
"لیکن آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں وہاں جانا چاہتا ہوں ۔؟" اس نے پوچھا۔
"خط کا مضمون جان لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر ۔" محبوب چہکے ۔ یہ میرا ہی شعر ہے ۔" اس سے پہلے کہ نجمی صاحب اسے گھورتے، وہ خود ہی

خاموش ہو گیا۔

"اچھے لوگوں سے راہ و رسم رکھنے میں حرج بھی کیا ہے ۔" نجمی صاحب بولے "کچھ دنوں تک تمھیں مصروف رکھنا چاہتا ہوں۔ بعد میں تمہارا علاج کرنے کا طریقہ بھی سوچ لیا ہے میں نے۔"

"مطلب ہے کہ آپ ساجد کا علاج کرائیں گے ۔۔!" محبوب بولا۔ کون سے حکیم صاحب سے ۔۔؟"

"حکیم لقمان سے ۔۔ تم سے مطلب ؟" نجمی صاحب جل کر بولے۔

"مگر انھیں تو وہم کی بیماری ہے اور سنا ہے کہ اس کا علاج تو ان کے پاس بھی نہیں تھا، کیوں نہیں تھا یہ میں آپ کو پھر بتلاؤں گا۔"

"۔۔ ساجد! یار تم نے کیا چیز پکڑ رکھی ہے ۔" نجمی صاحب کا خون کھول چکا تھا "وہ میرے بار کے بھیجا ہے ہی نہیں ۔۔"

ساجد نجمی صاحب کو اول فول بکتا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ محبوب علی مجذوب کی آمد غنیمت ہے کیونکہ اگر وہ چیز یہاں کوسانی میں نہیں آتی تو ساجد اتنے کھلے دل سے نہیں ہنس سکتا تھا۔ نجمی صاحب چاہتے ہیں کہ وہ ہنسے لہٰذا اب وہ قدرے خوش ہے۔ اسے محبوب اور نجمی صاحب کی دو دو چونچیں پسند تھیں۔ جب وہ محبوب کی طرف تیوری پر بل ڈال کر دیکھتے تو ساجد کو بڑی مسرت حاصل ہوتی تھی۔

آہستہ آہستہ وہ کشور کے بنگلے پر جانے لگا۔ محبوب بھی اس کے ہمراہ ضرور ہوتا۔ کشور اس سے زیادہ محبوب میں تفریح کے لحاظ سے دلچسپی لیتی تھی۔ کیونکہ محبوب شاعر ہی نہیں بلکہ ہر فن مولا تھا۔ بلکہ اگر

یوں کہا جائے کہ وہ خود کو ایسا سمجھتا تھا تو زیادہ ٹھیک ہے اُسے فلسفہ پر بھی کامل عبور تھا اور مذہبی امور میں بھی ید طولیٰ رکھتا تھا۔ اتفاق کی بات کہ ایک دن کشور نے مولوی صاحبان پر کوئی ریمارک کس دیا۔۔ بس پھر کیا تھا۔ محبوب صاحب بپھر گئے۔

"آپ علمائے دین کو برا نہیں کہہ سکتیں۔ اُن سے ہی مذہب قائم ہے اور انہیں کے دم سے پوری دنیا میں مسلمان موجود ہیں۔ ورنہ یقین مانئے کبھی کے ختم ہو گئے ہوتے۔۔۔ کیوں ختم ہو گئے ہوتے، یہ میں آپ کو پھر۔۔۔۔"

"نہیں آپ ابھی بتا دیجئے۔۔" کشور اُس کی عادت سے واقف ہو چکی تھی۔

"میں کیا بتاؤں۔ میں خود بھی مولوی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں نماز روزے کا سختی سے پابند ہوں۔ لہٰذا میں یہ کس طرح برداشت کر سکتا ہوں کہ آپ مولوی صاحبان کو برا بھلا کہیں۔۔؟"

"آپ کے اِس وصف کا تو آج ہی پتہ چلا۔۔" کشور واقعی مرعوب ہو گئی"۔ پھر تو آپ نے یقیناً حج بھی کیا ہو گا!"

"گنہ گار اتنا ہوں کہ حج کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ خود میرا ہی ایک مقطع ہے۔

کعبے کس مونہہ سے جاؤ گے مجذوب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

کہیئے ایمان سے کیسا شعر ہے؟۔۔"

"واقعی یہ تمہارا شعر ہے؟" ساجد نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

"اور نہیں تو کیا تمہارا ہے؟"

"معاف کرنا در اصل میں اسے غالب کا سمجھا تھا۔"

" اماں غالب اپنے زمانے میں ہی غالب تھا۔ آج کل تو بیچارے کی دال بالکل نہیں گلتی۔ کیوں نہیں گلتی، یہ میں تمہیں پھر کبھی بتاؤں گا۔"

"نہیں میں معلوم کرنا بھی نہیں چاہتا۔ تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔"

"شکریہ شکریہ ۔۔۔" مجاز۔ ڈیب ساجد کو کاٹ کرتے نہ پاکر بیحد خوش ہوا۔ اُدھر کشور تھی کہ اس کا سانس پیٹ میں سماتا ہی نہیں تھا، غریب ہنستے ہنستے دہری ہوئی جاتی تھی۔

ساجد اب گھنٹوں اس کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ وہ اس سے باتیں کرتے کرتے نہ تھکتا تھا۔ بس ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھے جاتا اور وہ بھی اسے نظر بچا بچا کر دیکھتی۔ ساجد کو اب اعتراف کرنا پڑا کہ قدرت بے انصافی سے کام ہرگز نہیں لیتی۔ اس کے ہاں دیر ضرور ہے مگر اندھیر نہیں۔ اس حسین جنت میں اتنی حسین حور کی محبت اسے ملی ہے!۔ خدا کا یہ احسان کچھ کم نہ تھا۔!

پھر ایک دن وہ آگیا جب کشور اس کے شانہ بشانہ چلنے لگی۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر قدم سے قدم ملا کر اور تب ساجد کو محسوس ہوا کہ دنیا میں اگر کوئی خوش قسمت انسان ہے تو بس صرف وہی ہے۔ وہ دونوں روزانہ ٹیڑھے میڑھے پہاڑی راستوں پر ڈگمگاتے ہوئے چلتے ــــ کشور ہانپتے ہانپتے جب ڈگمگا جاتی تو وہ بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیتا۔ جب وہ تھک جاتی تو ساجد کے قوی بازو اُسے اُٹھا لیتے

کتنی درخشاں ساعتیں تھیں ـــــ کتنے حسین لمحات تھے!

اُس کا جی چاہتا تھا کہ بس یہیں۔ اِسی خطّے میں دم نکل جائے!

اس کا دم نکالنے کے لئے درحقیقت ایک شخص اُن دنوں بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا۔ اور وہ شخصیت تھی انجینئر زماں کی جو کشور کا بھائی تھا اور جو ساجد کے ساتھ کشور کی بڑھتی ہوئی بے تکلفی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ زماں کا خیال تھا کہ ساجد جیسے لاابالی انسان کشور جیسی حسین اور خوبرو لڑکی کے لئے نہیں ہیں۔ ایسے نوجوان تو اُس بگولے کی مانند ہوتے ہیں، جو ابھی تو کسی خاص مقام پر منڈلا رہا ہے اور پھر فوراً ہی کسی اور خطے کو اپنی گرفت میں لے لیتا۔

اُس کے حالات و خیالات سے بے تعلق ساجد، کشور سے روز بروز بے تکلف ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دونوں گنگناتے ہوئے چشموں کے کنارے بیٹھ کر پہروں راز و نیاز کی باتیں کرتے۔ ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے گھنٹوں نظروں کا تبادلہ کرتے رہتے!

خوش گلو طیور ان کے سامنے آکر حیرت سے اپنی ننھی منی آنکھوں سے انھیں دیکھتے اور اڑ جاتے۔ چشمے کا بہتا ہوا پانی بار بار اچھل کر انہیں دیکھنے کی کوشش کرتا اور بادل صرف انہیں دیکھنے کی خاطر اور نیچے جھک کر ہوا میں تیرنے لگتے۔

اور پھر اُسے نہ جانے کیا سوجھتی کہ وہ کپڑے اتار کر غڑاپ سے یخ بستہ پانی میں کود پڑتا اور پھر کشور کے لئے سنہری مچھلیاں پکڑنے کی بہتیری کوشش کرتا مگر وہ ہاتھ میں آ آ کر پھسل جاتیں وہ ان کا تعاقب کرتا۔ پانی میں چھپا کے اُڑتے، اونچے نیچے پتھروں کو پھلانگتا وہ دور تک چلا جاتا مگر مچھلیاں ہاتھ نہ آتیں ــــ مچھلیاں تو بیشک ہاتھ نہ آتیں لیکن پہاڑی مینڈک ضرور اس کے ہاتھوں میں آجاتے۔ وہ دور سے مینڈکوں کی ٹانگیں پکڑ کر

کشور کو دکھاتا اور وہ کراہیت کے مارے چیخیں مارنے لگتی۔ پھر ایسا بھی ہوتا کہ یہی مینڈک اچھل کر اس کے اپنے جسم پر کود جاتے اور وہ گدگدی کی وجہ سے تڑپنے لگتا۔ کشور یہ حالت دیکھ کر ہنستے ہنستے سرخ ہو جاتی اور تب وہ اس کے قریب آ کر اس کے گالوں کو انگلی سے چھو کر کہتا۔

"کشور آفتاب غروب ہو رہا ہے"

محبوب صاحب خود بھی کشور پر فدا ہو چکے تھے۔ در اصل وہ ان انسانوں میں سے تھے جو ہر لڑکی پر عاشق ہونا اپنا فرض اولین خیال کرتے ہیں۔ ان کو اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ وہ لڑکی بھی ان پر مرتی ہے یا نہیں مرتی ـــ بس عاشق ہونا ان کے نزدیک ایک ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔

محبوب پہلے پہل تو کشور کی اداؤں پر قربان ہوتا رہا۔ اس کے ارد گرد پروانہ وار پھرتا رہا۔ مگر جب اس نے محسوس کیا کہ کشور اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی تو اس نے سمجھ لیا کہ اس کے جملہ حقوق ساجد کے نام محفوظ ہو چکے ہیں۔ لہٰذا جس شدت سے وہ اس پر عاشق ہوا تھا اتنی ہی جلدی وہ ساجد کے حق میں کشور سے دستبردار ہو گیا۔

لہٰذا اب جب کبھی ساجد کشور کے ہاں جاتا اور محبوب پر زور دیتا کہ وہ بھی چلے تو محبوب جان بوجھ کر کنی کاٹ جاتا اور عین وقت پر کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا۔ اس دن بھی ایسا ہی ہوا جبکہ ساجد زماں کی کوٹھی پر جانے کے لئے تیار ہوا تھا۔ محبوب کافی ٹال مٹول کرتا رہا اور پھر آخر کار ساجد کو تنہا ہی ادھر جانا پڑا۔

جب وہ کوٹھی کی طرف جانے والی پتلی سے پگڈنڈی پر چڑھنے لگا تو

اسے گذشتہ رات کو نجمی صاحب کی کہی ہوئی کچھ باتیں یاد آنے لگیں۔ انھوں نے ساجد کو غمزدہ دیکھ کر اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

"کیوں میاں ـــ میں نہ کہتا تھا کہ وہ تمہارے بغیر اداس رہا کرے گی۔ ایک لمحہ کے لئے بھی اسے قرار نہ ملے گا۔ تمہاری آغوش اس کے لئے جنت بن جائے گی ـــ لیکن اب جبکہ تم محبت کی دوڑ میں آگے نکل گئے ہو، میں تمہیں ایک کارآمد بات بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں ـــ اور وہ بات یہ ہے کہ اگر یہ گڑیا حادثۃً تمہارے ہاتھوں سے چھین لی جائے تو خدا کے لئے عورتوں کی طرح آنسو بہانے مت بیٹھ جانا ـــ نگاہوں کو خیرہ کر دینے والے ستارے رات کو آسمان پر چمکتے ہیں اور سحر کو غائب ہو جاتے ہیں ـــ مگر ہمیشہ کے لئے غائب نہیں ہو جاتے۔ اگلی رات کو دوبارہ ضرور دمکتے ہیں ـــ دُنیا میں ہر چیز دوبارہ مل سکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ تم اس کے لئے بیقرار نہ ہو ہاتھ نہ ملو اور منھ لٹکا کر نہ بیٹھ جاؤ ـــ اگر کشور، یا اس کے رشتہ دار محبت کی انتہائی منزل پر آکر تم سے جدا ہو جائیں یا تمہارے حسب منشا سلوک نہ کریں تو بیٹے وہیں بیٹھ کر سر کھوڑنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ سمجھ لینا کہ تم ایک سراب کے پیچھے دوڑ رہے تھے اور سراب ہمیشہ نظر کا دھوکا ہی ثابت ہوا کرتے ہیں۔ کسی کے لئے راتوں کی نیند خود پر حرام کر لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ صرف یہی ہوتا ہے کہ عمر کم ہو جاتی ہے اور انسان چپ چاپ گذر جاتا ہے اِس دنیا سے ـــ"

ساجد گذشتہ رات بھی یہ باتیں سن کر مسکرایا تھا اور جبکہ وہ کوٹھی کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ تب بھی وہ باتیں یاد کر کے مسکرا اٹھا ـــ نجمی صاحب کتنے پتے کی باتیں کہتے ہیں!

۷

پہاڑی ملازم کو اپنی آمد کی اطلاع دینے کے بعد وہ ڈرائنگ روم کی ایک نفیس کرسی پر بیٹھنے ہی لگا تھا کہ پشت کی سمت سے زماں داخل ہوا۔

"مسٹر ساجد ــــ میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"فرمایئے ــــ"

"آپ یہ کھیل آخر کب تک کھیلتے رہیں گے؟"

"میں سمجھا نہیں ــــ"

"آپ بچے نہیں ہیں خوب سمجھتے ہیں۔ اب اس آنکھ مچولی کو بند ہو جانا چاہیئے۔" ساجد خاموش رہا لیکن زماں نے پھر کہا

"میری بڑی بدنامی ہوتی ہے۔ کشور سے زیادہ مجھے اپنا خیال ہے۔ لوگ میری طرف انگلیاں اٹھانے لگے ہیں ــــ" زماں کا لہجہ بتدریج سخت ہوتا جارہا تھا۔

"انگلیاں تو آج تک سب پر ہی اٹھتی آئی ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں

ہے —" ساجد کا لہجہ پر سکون تھا۔

"لیکن میں اُٹھتی ہوئی انگلیوں کو کاٹ کر پھینک دینا جانتا ہوں۔"

ساجد کے جواب سے بپھر گیا تھا۔

"تو کاٹ کر پھینک دیجئے۔ مجھے کیا غرض ہے، انگلیاں اٹھانے والا ہاتھ میرا تو نہیں ہے —"

"اس وقت سے بچو مسٹر جبکہ میرا ہاتھ تم پر اٹھ جائے گا —"

"آپ حد سے بڑھتے جا رہے ہیں زماں صاحب۔ گھر پر آئے ہوئے مہمان کی اس طرح تواضع نہیں کی جاتی —"

"جس طرح تواضع کرنی چاہیئے وہ طریقہ تو میں نے ابھی استعمال ہی نہیں کیا ہے۔"

"زماں صاحب! —" ساجد کھڑا ہو گیا۔ "میں کوئی گرا پڑا شخص نہیں ہوں۔ ایک ذی حیثیت آدمی ہوں۔ آپ کی بہن سے بے لوث محبت کرتا ہوں یہ آپ بھی جانتے ہیں۔ میری بے غرض الفت کو اتنا رسوا نہ کیجئے۔ میں آپ کی عزت کرتا ہوں، ایسا نہ ہو کہ میرے دل میں کوئی میل اور کدورت پیدا ہو جائے —"

"تب اس سے کون سا طوفان آجائے گا!" زماں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "سنو مسٹر، میں آپ کو آخری بار تنبیہ کر دینا چاہتا ہوں اور بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ جیسے کم حیثیت انسان کے ساتھ میں اپنی بہن کا گھومنا پھرنا پسند نہیں کرتا اور ابھی جو آپ نے خود کو ذی حیثیت ثابت کرنا چاہا تھا تو معاف کرنا میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ آپ کا اپنا کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہے نجمی صاحب کا ہے۔ لہٰذا دوسروں کے کاندھے پر رکھ کر

بندوق چلانا ٹھیک نہیں ۔"

"زماں صاحب آپ کا لہجہ نہایت تحقیر آمیز ہے۔ یہ انداز شرفائے کا نہیں ہے ۔"

"میں زیادہ بدتمیزی پسند نہیں کرتا ۔ گٹ آؤٹ!"

ساجد کا رواں رواں لرز گیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، وہ دروازے کی طرف قدم بڑھا ہی چاہتا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔ "ٹھہریئے!" اس نے مڑ کر دیکھا تو کشور بھری ہوئی شیرنی کی طرح اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کی سرمگیں آنکھوں میں آتش فشاں کی سی چمک تھی۔ زماں کو اس نے اس انداز سے دیکھا کہ اس نے جلدی سے نظریں چرا لیں!

"آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ میرے دوستوں سے اس ہتک آمیز رویئے سے گفتگو کریں ۔"

"دوستوں سے یا عاشق سے ۔" زماں نے دبی زبان سے کہا۔

"بھیا ۔!" کشور اس بری طرح چیخی کہ آواز ہال میں گونج اٹھی ۔ "کس طریقے سے بات کرتے ہیں آپ۔ کیا آپ کی نظروں میں بہن کی یہی وقعت ہے ؟"

"تم ۔ تم اس شخص سے کہہ دو کہ یہاں سے دفع ہو جائے ۔" زماں غصے سے کپکپا رہا تھا۔ "ورنہ میں کچھ نہ کچھ کر بیٹھوں گا ۔"

"آپ کچھ نہیں کریں گے۔ آپ کی عزت اور ثروت میرے پاؤں کی بیڑی نہیں بن سکتی بھیا ۔"

"کشور ۔!" وہ دہاڑا۔

"ہاں ۔ جب میری عزت کا دامن داغدار نہیں ہے تو میں کسی کی عزت

جانے کی فکر نہیں کرتی میں جب پاک و صاف ہوں تو پھر آپ کی عزت بھی محفوظ ہے۔"

"آپ لوگ خواہ مخواہ مجھ جیسے حقیر انسان کی خاطر اپنے مزاج بگاڑ رہے ہیں۔" ساجد نے مرتعش لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "میں اپنے رویّے کی معافی چاہتا ہوں زماں صاحب۔ اب میں کبھی یہاں نہیں آؤں گا۔ میری اوقات ہی کیا ہے کہیں ذروں نے آفتاب کی برابری کی ہے ——؟"

زماں خاموش کھڑا رہا اور وہ دروازے کی سمت بڑھتا رہا۔ وہ سیڑھیوں پر قدم رکھنا چاہتا ہی تھا کہ کشور کی آواز نے اس کے قدم پکڑ لئے

"ٹھہرو ساجد —— میں اُن لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو حالات کے آگے سپر ڈال دیتی ہیں۔ میں حالات کو بدلنا جانتی ہوں —— مجھے بھیا سے کچھ کہنے دو۔"

ساجد چلتے چلتے رک گیا۔ مگر پیچھے نہیں مڑا۔

"بھیا آپ غور سے سن لیجئے۔" کشور کے حسین رخ پر پاکیزہ محبت کا جلال چھایا ہوا تھا۔ "جو بات میں نے آج تک ساجد سے نہیں کہی، وہ آپ سے کہتی ہوں۔ میں نے ساجد سے آج تک اقرار نہیں کیا مگر اب کہتی ہوں کہ میں اُسے اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہی میری زندگی ہے اور وہی میری روح وہ میری آرزوؤں کا مرکز ہے اور میں اس مرکز سے کبھی دور نہیں جا سکتی —— آپ سن لیجئے کہ آئندہ میرے معاملات میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔ میں ساجد کی ہوں اور ہمیشہ اس کی رہوں گی ——"

ساجد پلٹا۔ اُس کے لب فرطِ مسرت سے کپکپا رہے تھے۔ وہ قدم

بڑھانا چاہتا تھا مگر قدموں میں لرزش تھی۔ اسے سکتہ ہو گیا۔ باوجود کوشش کے اُس کے مونہہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ اُدھر نرماں یوں کھڑا ہوا تھا گویا اس کے کانوں میں کسی نے پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا ہو۔ پیشانی پر برہمی کی لکیریں گہری ہو گئی تھیں۔ چہرے پر جیسے کسی نے گلال مل دیا تھا۔ آنکھوں میں ایسا قہر اور ایسا جلال تھا گویا جس کو دیکھ لے وہ پھنک کر رہ جائے۔ وہ بالکل خاموش رہا بے پناہ طیش کی ایک نظر سے جس میں ہزاروں شکوے پنہاں تھے اس نے کشور کو دیکھا اور پھر آہستہ سے ساجد سے مخاطب ہوا۔

"مسٹر ساجد۔ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں اور تم بھی کشور — آئندہ میں تم دونوں کی راہ میں دیوار نہیں بنوں گا۔"

پھر ایک نہایت ہی حسین اور خنک رات آئی۔ کشور کے حسین اور ماہتابی چہرے جیسا چاند برفانی چوٹیوں کے عقب سے طلوع ہوا اور پھر ٹھنڈی ہواؤں کے دوش پر چلتا ہوا، جھیل کے اوپر آکر ٹھہر گیا!

وہ دونوں گلاب کے معطر پودوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے تھے اور اس چاند کو غیر متحرک پانی میں دیکھ رہے تھے۔ پھیکی پھیکی سی چاندنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ اطراف کی ہوائیں معطر ہو کر اس لئے بوجھل ہو گئی تھیں کہ ساجد اس کے چمکیلے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہا تھا۔ گلاب کی ایک ننھی سی کلی پھولوں کو ادھر ادھر ہٹا کر تیزی سے اُوپر اُبھری اور زبردستی ساجد کے ہاتھوں سے ٹکرا گئی۔ اس نے پھر یہ کلی انگلیوں سے توڑی اور کشور کے بالوں میں لگا دی۔

کلی جھوم کر اچانک پھول بن گئی!

"ساجد —!" کشور نے چاند کو دیکھتے ہوئے کہا

"ہوں ـــ"

"تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں ـــ"

"کہو ـــ"

"بھیا لاکھ میرے اور تمہارے مخالف سہی لیکن پھر میرے بھائی ہیں۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" ساجد نیم دراز حالت سے ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"یہی کہ وہ مجھ سے ان دنوں بات نہیں کر رہے ہیں۔"

"واقعی یہ تشویشناک ہے۔"

"اُدھر لکھنؤ میں امّی کی طبیعت بھی کچھ خراب ہو گئی۔ ٹیلی گرام آیا تھا۔ بھیّا نے مجھ سے کچھ کہا نہیں اور تار میری طرف بڑھا دیا۔"

"تو ـــ تو کیا تم چلی جاؤ گی؟" ہزاروں وسوسوں نے اسے گھیر لیا۔

"جانا تو پڑے گا ـــ"

"وہ نہیں جائیں گے ـــ؟"

"نہیں ـــ اُنھیں کل ہی سے اُس پلان کا آغاز کرنا ہے جو دراصل کالاگھاٹ والی پکّی سڑک کو یہاں کو سانی سے ملاتا ہے۔ کل سے پہاڑوں میں کھدائی اور کٹائی کا کام ان کی نگرانی میں شروع ہو رہا ہے ـــ"

"مگر میرے خواب کشور ـــ؟"

"خوابوں کی تعبیر تو اچھی ہی نکلے گی۔ بس کچھ دن تک ہم دونوں کو صبر کرنا پڑے گا۔ لکھنؤ جا کر میں امی سے تمہارا ذکر کر دوں گی اور وہ یقیناً ڈیڈی کو راضی کر لیں گی۔"

"اچھا ـــ خبر تو اچھی ہے ـــ مگر میں تمہاری جدائی کس طرح برداشت

کر سکوں گا"

"تم سمجھتے ہو کہ میں برداشت کر لوں گی!"

"اوہ — کشور!" وہ کھل اٹھا۔

"حالات بعض اوقات انسان کو مجبور کر دیتے ہیں ساجد — اور پھر ایک بات اور بھی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس عرصہ میں جبکہ میں یہاں موجود نہ ہوں تم بھیا سے میل جول برابر قائم رکھو"

"مگر — مگر وہ تو میری صورت تک کے روادار نہیں ہیں"

"تم انہیں اپنے ہاں مدعو کرو۔ مجھی چچا سے کہو وہ انہیں بلائیں۔ میں بھیا کو خوش کرنا چاہتی ہوں۔ ان کی ناراضی مول لے کر ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے"

"صحیح کہتی ہو" ساجد اتنا کہنے کے بعد ان اندھیروں کو دیکھنے لگا جو پہاڑ کے دامن میں رینگ رہے تھے۔

کشور نہ جانے کتنی دیر تک اسے دلاسے دیتی رہی لیکن اس کی روح پر اضمحلال طاری ہو چکا تھا اور اسے یقین ہونے لگا تھا کہ مسرت کا یہ چاند جو اسوقت آسمان پر چمک رہا ہے، اب کچھ ہی دیر جاتی ہے کہ ظلمتوں میں جا کر کھو جائے گا!

ذرا سی خوشی کی خاطر اس نے کتنی تگ و دو کی ہے! جتنی تیزی سے وہ مسرتوں کا تعاقب کرتا ہے وہ اتنی برق رفتاری سے اس سے دور ہوتی جاتی ہیں۔!



اور پھر وہ دن بھی جلد آ گیا جب کہ خواب حقیقتوں کا شکار ہوئے اور نجمی صاحب کی کہی ہوئی سبھی باتیں سچ ہونے لگیں۔ کشور جب اپنی سہیلیوں کے ساتھ بس میں سوار ہونے لگی تو ساجد سے نہ رہا گیا۔ اس نے کشور کے ننھے منّے ہاتھوں کو بھینچ لیا۔ رندھے ہوئے گلے سے اس نے وعدہ کیا کہ وہ ساجد کو ہرگز نہ بھولے گی اور جلد ہی واپس آئے گی۔ اپنی سہیلیوں کے سامنے وہ اپنا راز کھلنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ لہٰذا ساجد سے یہ وعدہ کر کے کہ وہ اسے جاتے ہی خط لکھے گی بس کے اندر بیٹھ گئی۔ بس روانہ ہو گئی اور ساجد کی اشکبار نظریں اُسے دور تک چھوڑنے گئیں۔

جب وہ واپس بنگلے کی طرف آنے لگے تو نجمی صاحب نے اس کا دل ہاتھوں میں لیا۔ اسے تسلّی دیتے ہوئے انھوں نے کہا۔۔۔

"بھئی تم بڑے کچے دل کے ہو۔ اب خواہ مخواہ اداسیوں کو گلے لگانے کی کوششیں کر رہے ہو۔ دنیا میں اس طرح نہیں جیا جاتا۔ میرے یار اگر وہ

چلی گئی تو کیا ہوا، وعدہ تو کر گئی ہے۔ وعدوں پر جیوگے تو بڑی راحت ملے گی۔ تمہاری سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ تمہیں خود پر اعتماد نہیں ہے۔ تم تاریک پہلو ہی دیکھتے ہو۔ حالانکہ روشن پہلو بھی تو ہیں ــــ! مجھے تو تعجب ہوتا ہے کہ اتنی حسین جگہ بھی تم غم زدہ سے رہتے ہو۔ کشور ہمیشہ کے لئے نہیں گئی ہے۔ جب تک وہ واپس آئے تو تم ان دل آویز مناظر سے دل بہلاؤ۔ جس خدا نے کشور کو حسن بخشتا ہے اسی نے کچھ اور چیزوں کو بھی اس سے نوازا ہے۔ یہ خوب صورت مناظر برسوں سے تمہاری راہ دیکھ رہے تھے۔ نہ جانے تم کب آؤ اور انھیں آ کر دیکھو۔ اب آ گئے ہو تو ان کو نا امید کیوں کرتے ہو۔ جی بھر کے ان نظاروں کو دیکھو، تمہیں ہر خوبصورت شہ میں کشور کی شبیہہ نظر آئے گی۔ یہاں کا ایک ایک پھول، ایک ایک غنچہ، سب تمہارے انتظار میں پلک جھپکائے بغیر یوں ہی کھڑے ہیں۔ ان کے قریب جاؤ اور ان سے باتیں کرو۔ میں تو تمہیں سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا۔ اب ہنس دو کیوں کہ روتے ہوئے چہرے میری چڑ ہیں"

نجمی صاحب کا کہنا مان کر وہ بے دلی سے مسکرا دیا۔

اور یہ مسکراہٹ اس وقت تو اور بھی دل آویز ہو گئی جب اسے دور سے محبوب اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

"بھئی حد ہو گئی، صبح سے ایک وداعی شعر کہنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کم بخت ہو کر ہی نہیں دیتا تھا ــــ کیوں ہو کر نہیں دیتا تھا، یہ میں تمہیں پھر کبھی بتلاؤں گا ــــ"

"ہمیں معلوم ہے، بتانے کی کوئی ضرورت نہیں ــــ" نجمی صاحب کا منھ بن چکا تھا۔

"کیا ــــ ؟"

"یہی کہ احمق کبھی اچھے شاعر نہیں بن سکتے۔"

"کیوں نہیں بن سکتے جناب، ایک شاعر تھے تو احمق پھپھوندوی۔ بڑے اچھے شاعر تھے۔" نجمی صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش رہے۔

"ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تب تو ہوا نہیں شعر — بس ابھی ابھی ہوا ہے میں نے سوچا کہ کشور کہیں چلی نہ جائیں لہذا دوڑتا ہوا جاؤں اور انھیں شعر سناؤں۔ ان کے جانے سے متاثر ہو کر کہا ہے۔"

"مگر وہ بچاری تو چلی گئی —" نجمی صاحب نے محبوب کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ "کیوں چلی گئی، یہ میں تمہیں پھر بتلاؤں گا —"

ساجد ہنسنے لگا اور محبوب جھینپ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ چند لمحے بعد ساجد ہی بولا۔

"چلو تم شرمندہ نہ ہو، وہ شعر اب مجھے سنا دو۔"

"اماں یار کیا خاک سناؤں۔ تم لوگ کیا داد دوگے جو وہ دیتیں۔"

"اب تک بھی چپکو — کیوں ترسا رہے ہو۔" نجمی صاحب نے سوچا تھا کہ گفتگو مختصر ہو جائے۔

"عرض کرتا ہوں۔" محبوب نے پینترے بدلتے ہوئے کہا۔ "عرض کرتا ہوں، یعنی کیا قیامت کا شعر ہے — صبح سے لے کر دوپہر تک مکمل ہوا ہے۔ عرض کرتا ہوں۔

جاتے ہوئے کہتے ہو"

"کیا کہتے ہو —؟ نجمی صاحب نے لقمہ دیا۔

"عرض کرتا ہوں کہ۔ جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے

مجذوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور"

نجمی صاحب تو چندھیائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگے اور ساجد منھ پھیر کر ہنسنے لگا۔

"ہئے ہئے مجذوب ظالم کیا کہہ گیا ہے!" مجذوب نے اپنی ہی تعریف کرتے ہوئے کہنا شروع کیا — "گویا کہ قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور — آہاہا کیا قیامت کا شعر ہے"

"شعر تو واقعی قیامت کا ہے —" نجمی صاحب بولے "لیکن بیٹا جب یہ قیامت ہوگی تو ایک نحیف و نزار اور بوڑھا شخص تمہارا دامن پکڑے ہوئے ہوگا —"

"کیوں جناب ایسا کیوں ہوگا۔؟" محبوب نے چونک کر پوچھا۔

"ایسا اس لئے ہوگا کہ انفاق سے وہ شخص غالب ہوگا۔"

"تو پھر کیا ہوا۔؟" محبوب ڈھٹائی سے بولا "وہاں غالباً وہ یہی کہے گا کہ یہ شعر اس کا ہے۔ میدان حشر میں اس احمق سے بحث کون کرے گا۔ میں فوراً مان لوں گا اور اپنا یہ شعر اُسے مفت دے کر ایک نیکی کا حق دار بن جاؤں گا۔ کیوں کیسی رہی؟"

نجمی صاحب سوائے دانت پیسنے کے اور ساجد ایک بلند و بانگ قہقہہ لگانے کے اور کیا کر سکتا تھا۔!

اس کی زندگی کی عمارت دراصل کھوکھلی بنیادوں پر رکھی گئی تھی، اور اس میں اس کا اپنا کچھ قصور بھی نہیں تھا۔ اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔ قسمت! جو نہ تو خود سے بنائی جاتی ہے اور نہ بگاڑی جا سکتی ہے۔!

کشور کیا گئی، اس کے ارمانوں کا قافلہ لوٹ کر لے گئی۔ اس کی

امیدوں کا جنازہ نکل گیا۔ تمام خیالی محلات دھڑام سے نیچے آرہے۔ دنیا اس کی نظروں میں اور تاریک ہوگئی۔ انبساط کا چاند طلوع ہوتے ہی غم کی سیاہ بدلیوں میں ڈھک کر رہ گیا تھا۔!

محبوب جب تک سامنے رہتا ہے، قریب رہتا ہے، انسان کی آنکھ کے آگے ہر لمحہ پھلجھڑیاں سی چھوٹتی رہتی ہیں۔ پوری کائنات حسین نظر آتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے جیسے دل پر غموں کا اتنا سا بھی بوجھ نہیں ہے۔ مگر پھر ذرا سی دوری ___ ذرا سا بُعد کتنا تغیر پیدا کر دیتا ہے۔ وہی دنیا جس پر انسان مر رہا تھا ___ اب جہنم نظر آنے لگتی ہے!

اور پھر یہ اس سے دو دن بعد کا ذکر ہے کہ اس کی ملاقات اچانک زماں سے ہوگئی۔ وہ سکون کی تلاش میں پیدل ہی کچے راستے پر ہو لیا تھا۔ ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس سے وہ بے مدعا خودرو جھاڑیوں کو روندتا ہوا چل رہا ہے۔ زماں اپنے چند ماتحتوں کے ساتھ ایک مقام پر کھڑا ہوا تھا۔ غالباً وہ اس علاقے کا معائنہ کرنے آیا تھا۔ جب وہ اس کے قریب سے گذرنے لگا تو اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ ساجد نے سلام کر لیا۔ اس کی پیشانی پر برہمی کی لکیریں پیدا ہو کر مٹ گئیں اور تب اس نے بڑی نرمی سے کہا۔

"آپ مجھ سے کٹ کر آگے بڑھنا چاہتے تھے ___!"

"میں آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا ___"

"شکایت کیسی ___ اس دن واقعی میں نے زیادتی کی تھی، مجھے افسوس ہے ___"

ساجد اس کے لہجے کی نرمی سے حیران ہوئے بغیر نہ رہا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ کشور نے چلتے وقت اس سے کہا تھا کہ وہ زماں سے میل جول قائم رکھے،

اور اسے اپنے ہاں مدعو کرے۔ اس نے سوچا کہ لوہا اس وقت گرم ہے، یہی وقت چوٹ مارنے کا ہے۔

"میں بھی بہت شرمندہ ہوں۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ آئندہ کشور سے کوئی راہ و رسم نہ رکھوں گا —" یہ جھوٹ بولتے ہوئے ساجد کا دل ایک بار ضرور کانپ گیا۔ مگر مصلحت یہی تھی۔

"اچھا —!" زماں کو بے حد تعجب ہوا۔

"جی ہاں — میں کسی کا دل دکھانا نہیں چاہتا —"

"مگر اس اقدام سے کشور کا دل تو ضرور دکھے گا — کیا آپ یہ برداشت کر لیں گے!" زماں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ پھیرا۔

"آپ کی خوشنودی کی خاطر میں یہ بھی برداشت کر لوں گا۔"

"میں آپ کی نیت پر شک تو نہیں کرتا مگر مجھے پھر ایک بار تعجب کا اظہار کرنا پڑ رہا ہے۔" زماں مسکرا کر بولا۔ "مگر ٹھہریئے، آپ کا منشا یہ تو نہیں ہے کہ میری خوشنودی حاصل کرنے کے بعد ہی آپ کشور کو حاصل کر سکتے ہیں۔؟"

"آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔"

"ہوں —" زماں نے آہستگی سے کہا اور پھر متفکرانہ انداز میں پہاڑوں کے نشیب کو دیکھنے لگا۔ چند لمحوں تک یہی محویت قائم رہی۔ اس نے اس طرح ساجد کی آنکھوں میں دیکھا گویا اس کی آنکھوں کے ذریعے دل تک اتر جانا چاہتا ہو۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ کوئی شخص اتنی جلد بھی بدل سکتا ہے۔ اور اپنے چاہنے والوں کو یوں بھول سکتا ہے گویا کبھی ان سے واقفیت ہی نہ رہی ہو! پھر بھی اس نے مناسب سمجھا کہ اس کی بات کا یقین کر لے۔

"خیر کوئی بات نہیں — دراصل یہ خاندانی غیرت اور حمیّت کا تقاضا

تھا جو میں نے آپ سے مغائرانہ برتاؤ کیا۔ بہرحال۔"

"میں چاہتا ہوں کہ آپ کل دوپہر کا کھانا غریب خانہ پر تناول فرمائیں۔"

ساجد نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔

زماں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ یہ چاپلوسی کی باتیں دراصل اسے اپنا بنانے کے لئے ہیں۔ ساجد کی آنکھوں میں اس نے وہ چمک دیکھی تھی جو ایک بلّی کی آنکھوں میں چوہے کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ اس نے دل میں سوچا کہ اسے یہ دعوت اس لئے منظور کر لینی چاہیئے کہ وہ ساجد اور نجمی صاحب کے قریب رہ کر ان دونوں کے بارے میں زیادہ جان سکے گا۔ لہذا اس نے پرجوش لہجے میں جواب دیا۔

"بہتر ہے، مجھے کوئی اعتراض نہیں، حاضر ہو جاؤں گا۔"

ساجد خوشی خوشی ان سے ہاتھ ملا کر واپس چڑھائی پر قدم بڑھانے لگا اور اُدھر زماں اُسے کینہ توز نظروں سے گھورتا رہا۔ بے چارے ساجد کو بھلا کیا علم تھا کہ کشور کو بلانے کا فرضی تار اس نے خود ہی ڈلوایا تھا۔ منشا صرف یہ تھا کہ کشور کو سانی سے واپس چلی جائے۔ اسی پر بس نہ کرتے ہوئے اس نے اپنی امّی کو لکھا تھا کہ وہ کشور کا خیال رکھیں اور اُسے اب کو سانی نہ بھیجیں۔ ساجد کے کردار کو اس نے بڑا گھناؤنا بنا کر اپنے خط میں پیش کیا تھا۔ ساتھ ہی اپنے ڈیڈی کو متنبہ کیا تھا کہ وہ کشور کا رشتہ جلد سے جلد کہیں طے کر دیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ان کی خاندانی عزت و وقار کی عمارت منہدم ہو جائے گی!

غرض اس نے وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کر لئے تھے جن کی بدولت والدین کو کشور سے برگشتہ کیا جا سکتا تھا۔ اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ مطمئن تھا کہ اس نے ایک نیک فرض انجام دے لیا ہے۔

اگلے دن وہ سب کھانے کی میز کے گرد بیٹھے تھے۔ ساجد نے زماں سے کہی ہوئی سب باتیں نجمی صاحب کو سنادی تھیں۔ اس لحاظ سے نجمی صاحب نے کرّ و فر میں کوئی کمی نہ آنے دی تھی۔ میز پر ان گنت مرغن کھانے موجود تھے اور ڈائننگ روم کو انھوں نے خصوصی طور پر سجایا تھا۔ زماں ان کی محبت اور اخلاص دیکھ کر سچ مچ مرعوب ہو گیا تھا۔ اُسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے ناحق ہی لکھنؤ خط لکھا —— مگر اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

"آپ یہ پہاڑی مرغ کھائیے نا ——" محبوب نے دوستی کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔

"آپ لوگ بھی تو کھائیے۔" زماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور آجائیں گے آپ کھائیے تو سہی۔" نجمی صاحب نے کہا۔

"غالباً آپ سمجھ رہے ہیں کہ یہاں صرف دو ہی مرغ ہیں۔" محبوب بولا۔ "لیکن میں ثابت کر سکتا ہوں کہ اس میز پر دو نہیں بلکہ تین مرغ ہیں۔"

"کیا آپ سنجیدہ ہیں ——؟" زماں کو بڑی حیرت ہوئی۔

"بالکل سنجیدہ ہوں —— کیوں ہوں، یہ میں آپ کو پھر بتلاؤں گا۔"

"بہتر ہے کہ ابھی بتا دو —— پھر موقع نہیں مل سکے گا ——" ساجد نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں ہاں، ابھی فرمائیے ——" زماں کو بھلا کیا معلوم کہ محبوب کیا چیز ہے۔

"دیکھئے آپ میز پر دو مرغ دیکھ رہے ہیں نا ——"

"ہاں دیکھ رہا ہوں۔" زماں دلچسپی لیتے ہوئے قریب جھک گیا۔

"میں ریاضی کے اصولوں سے ثابت کر سکتا ہوں کہ یہ دو سے زیادہ مرغ ہیں ——"

"واقعی حیرت انگیز بات ہے، اچھا ثابت کیجیے۔"

"ابھی لیجیے — اچھا اب ذرا ان کو گنیے۔"

زماں نے مرغوں کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔

"یہ ایک اور یہ دو۔"

"کتنے ہو گئے؟ ایک اور دو مل کر کتنے ہوئے؟"

"تین —!"

"بس تو ثابت ہو گیا کہ مرغ دو نہیں بلکہ تین ہیں۔"

بڑے قہقہے لگے۔ زماں اتنے زور سے ہنس رہا تھا کہ اس کی کرسی بھی لرزہ بر اندام تھی۔ بہت دیر تک ہال میں قہقہے گونجتے رہے۔ اچانک زماں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"واقعی آپ نے کمال کر دیا۔ یہ تین ہی مرغ ہیں۔ اب ایسا کرتے ہیں کہ ایک نوتجمی صاحب کو دے دیتے ہیں، وہ ہمارے بزرگ ہیں، دوسرا میرے اور ساجد کے لئے کافی ہے۔ رہا تیسرا مرغ وہ آپ نوش فرما لیجیے۔"

اس بار پہلے سے بھی زیادہ زور دار قہقہے بلند ہوئے۔ ساجد کو تو اچھو ہو گیا اور وہ کرسی سے اٹھ گیا۔ نجمی صاحب کی باچھیں اس قدر کھل چکی تھیں کہ بند ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھیں۔ محبوب ہونقوں کی مانند مونہہ کھولے حیرت سے باری باری سب کو دیکھ رہا تھا۔ شرمندگی بری طرح اس پر حاوی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جواب کیا دے۔ اس کی ہیئت کذائی کو دیکھ کر نجمی صاحب چہکے۔

"کیوں بھئی چونچ کیوں بند ہو گئی۔ اب دو نا کوئی جواب۔"

"جواب —" محبوب چونک گیا۔ "ہاں کیوں نہیں دوں گا جواب — کب دوں گا، یہ میں آپ کو پھر بتلاؤں گا۔"

کھانے کے دوران میں مختلف قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ زماں کو نجمی صاحب تو بیشک پسند آئے۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ اسے ساجد ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ زماں کو ایسے لوگوں سے چڑ تھی جو ہر وقت مغموم و بیزار سے رہتے ہوں۔ ہر وقت کھوئے کھوئے سے، جب پکارو تبھی جواب ملتا ہے، ورنہ اسی طرح صُم بکمٌ بیٹھے ہیں اسے ان لوگوں پر بھی خار آتا تھا جو محض اس لئے افسردہ رہتے ہیں کہ دوسرے اُن سے ہمدردی جتائیں اور ان کی عزت کریں۔ زماں کے لئے یہ ایک نمائشی چیز تھی۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ خاندان بے شک اچھا ہے۔ ساجد کی اپنی کوئی جائیداد نہیں ہے تو نہ سہی۔ نجمی صاحب کی املاک کا تو وہ بلاشرکت غیرے مالک ہو سکتا ہے۔

کوئی اور ہوتا تو اپنی بہن کا رشتہ خود ہی لے کر پہنچ جاتا۔ مگر زماں دراصل ان لوگوں میں سے تھا جو ایک بار فیصلہ کر کے اسے تبدیل کرنا اپنی عزت کے منافی جانتے ہیں۔ عشق کرنے والے اسے کبھی پسند نہ آئے تھے۔ اس کے خیال میں عشق وشق کوئی جذبہ نہیں تھا بلکہ بوالہوسی کو یہ دوسرا نام دے دیا گیا تھا۔ اُسے آج تک کسی سے عشق ہوا بھی نہیں تھا۔ وہ تو دراصل ان لوگوں میں سے تھا جو عشق کے بغیر ہی اپنا کام نکال لیا کرتے ہیں۔ کوسانی کا پہاڑی حُسن اس کی دسترس سے باہر نہیں رہا تھا۔ اور اس نے اپنی من پسند کلیاں توڑ کر، ان کی خوشبو سونگھ لینے کے بعد انھیں مسل کر پھینک دیا تھا۔ اس کے نزدیک جنس لطیف کا مناسب استعمال یہی تھا۔

جب وہ وہاں سے اٹھا تو یہ سوچ کر اٹھا کہ ساجد سے زیادہ نجمی صاحب سے تعلقات استوار کئے جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں کوئی ایسا ذریعہ میسر ہو جائے کہ وہ خود ہی پہاڑی جنگلات اور زمینوں کا مالک بن جائے! خیال برا نہیں تھا۔ بس اس میں وقت، عقل اور ہمت کی ضرورت تھی اور اس کے خیال میں ان اوصاف کا وہ مالک تھا۔

۹

کشور کو اس حسین جنت سے گئے ہوئے مہینوں سے زیادہ ہو گئے تھے۔ ساجد کے لئے وہ دل نشیں خطہ جہنم بنتا جا رہا تھا۔ کیوں کہ ابھی تک کشور کا کوئی معطر خط نہیں آیا تھا۔ وہ روزانہ ڈاک کے وقت بنگلے کے دروازے کے باہر کھڑا ہو جاتا اور پھر پوسٹ مین کا انتظار کرتا۔ مگر خط نہ آتا تھا۔ ساجد کو محسوس ہوتا تھا گویا اس کی کوئی قیمتی شے اس سے چھین لی گئی ہے۔ اسے یہ احساس بھی ہوا تھا کہ ممکن ہے اس کے خط پوسٹ ماسٹر کی معرفت آئے ہوں، لہذا پہلی فرصت میں پوسٹ آفس چل کر اس کی چھان بین کرنی چاہیئے۔

پہاڑ کے پوسٹ آفس کی بساط ہی کیا تھی۔ ایک مختصر سا کمرہ تھا جس میں ٹوٹی سی ایک کرسی پر بوڑھا پوسٹ ماسٹر بیٹھا رہتا تھا۔ کرسی اور میزیں اس کاہی سے ملوث تھیں جو بادلوں کے اندر آنے سے پیدا ہو جاتی تھی۔ پوسٹ ماسٹر بڑے تپاک سے ملا۔ اور حقیقت سننے کے بعد مسکراتے ہوئے بولا۔

"جی نہیں شاب! بھلا ایسا کس طرح ہو سکتا ہے کہ آپ کے لیٹر غائب

ہوجائیں۔ لیٹر آئیں گے تو شاب فوراً پہنچا دیئے جائیں گے۔"

"تعجب ہے۔ خط تو ضرور آنا چاہیئے۔"

"ہاں آنا تو چاہیئے، لیکن اگر کوئی بھیجے گا تبھی تو آئیں گے۔" یہ محبوب کی منحنی آواز تھی جو ساجد کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آگیا تھا۔

"مگر محبوب — اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔" ساجد نے پلٹ کر جلدی سے اس سے کہا۔

"جن خطوں کا تم انتظار کر رہے ہو، وہ تو قسمت والوں ہی کے پاس آتے ہیں —"

"کیا مطلب۔؟" اس کی بھنویں تن گئیں۔

"مطلب یہ کہ وہ محترمہ تمہیں بھول چکی ہیں — اماں لڑکیاں بھی کبھی ایک کی ہو کر رہی ہیں۔ وہ تو صرف یہاں فلرٹ کرنے آتی ہیں ورنہ کیا وادیوں کے شہروں میں تم جیسے خوبرو جوانوں کا قحط پڑ گیا ہے۔؟"

"محبوب!" اس کا گلا بھر آیا۔ "اتنی صاف گوئی سے کام نہ لو۔"

"ہاں ایک بات اور بھی ہو سکتی ہے —" محبوب کو اچانک احساس ہوا کہ اسے ساجد کا دل ہاتھوں میں لینا چاہیئے — خواہ مخواہ اسے حقیقتوں کا آئینہ دکھانے کا فائدہ۔

"وہ کیا —؟"

"یہی کہ وہ خط لکھتے ہوئے شرماتی ہو، لجاتی ہو — جب بھی لکھنے بیٹھتی ہو بارحیا سے آنکھیں بند ہو جاتی ہوں۔ جب آنکھیں بند ہو جائیں گی تو کاغذ قلم بھلا کس طرح نظر آئے گا؟ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خط لکھ لکھ کر پھاڑ دیتی ہو۔ کیوں پھاڑ دیتی ہو — یہ میں ...."

"نہیں بھلا ایسا کس طرح ہوسکتا ہے ۔!"

"ہو کیوں نہیں سکتا — یہ تو ایک اٹل حقیقت ہے ۔ خود میرا ہی ایک شعر ہے...

مجذوبؔ انھیں خط کیسے لکھوں اب ہاتھ میرے تھراتے ہیں
یہ سادہ کاغذ دے دینا پیغام زبانی کہہ دینا "

"مذاق مت کرو ۔ میرے دل پر بنی ہے اور تم مذاق پر تلے ہوئے ہو ۔"

محبوب نے خدا کا شکر ادا کیا کہ حسب عادت ساجد نے اس بار یہ کہہ کر اس کا دل نہیں توڑا کہ یہ شعر میرؔ کا ہے ۔ اس نے کوشش کی کہ کسی طرح ساجد کو یہاں سے واپس لے چلے ۔

"ایک بات کا خیال مجھے اور آیا ہے — ہاں یہ بات بھی ہو سکتی ہے ۔"

"کون سی بات ؟" ساجد نے اشتیاق سے پوچھا ۔

"ہو سکتا ہے اس کا ہاتھ دل پر رکھا ہو اور وہاں سے جدا نہ ہونا ہو — لہذا وہ کس طرح خط لکھ سکتی ہے ۔ ملاحظہ ہو میرا ہی یہ شعر ۔

حالِ دل یار کو لکھوں کیونکر
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا "

ساجد نے خشمگیں نظروں سے اسے گھورا اور پھر ایک لفظ کہے بغیر آگے بڑھ گیا ۔ محبوب گھبرا گیا اور پھر جلدی جلدی قدم بڑھا کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا ۔

"تم ناراض ہو گئے — بتاؤ یار اب میں کیا کروں ۔ میں تو تمہیں خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں اور تم برا مان جاتے ہو ۔ کشور واقعی بہت اچھی لڑکی تھی لیکن اب مجھے تم پر رشک کے ساتھ ساتھ رحم بھی آ رہا ہے ۔ کیوں آ رہا ہے ؟ یہ میں تمہیں پھر بتلاؤں گا — میں جانتا تھا کہ وہ چلی جائے گی اور تم کفِ افسوس ملتے

رہ جاؤ گے۔ اگر میری مانو تو تم اس کا خیال چھوڑ دو۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے ــــ نجمی صاحب نے ایک بار بالکل سچ کہا تھا کہ تم بڑے حساس ہو اور محبت کے معاملے میں بہت جلدی سنجیدہ ہو جاتے ہو۔ کیوں ہو جاتے ہو، یہ میں نہیں پھر.....،،

،، اچھا اب تم خاموش رہو ــــ،، ساجد نے اس کی بات کاٹ کر ایک طویل سرد آہ بھری۔

اسی طرح دوسرا ہفتہ بھی گذر گیا اور ساجد کو یوں محسوس ہوا گویا صدیاں بیت گئی ہیں۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ اس کے پاس کشور کا پتہ نہیں تھا۔ وہ یہ پتہ زماں سے حاصل تو کر سکتا تھا مگر اس نے خود ہی اس سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ آئندہ کشور سے کوئی راہ و رسم باقی نہ رکھے گا۔ لہذا اب کس منہ سے وہاں جائے۔؟

اس کی شوریدہ سری کا یہ عالم تھا کہ راتوں کی نیند اور دن کا سکون عنقا ہو گیا تھا۔ پہروں وہ ایک ہی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا۔ تنہائی میں وہ سوچتا کہ کتنا بڑا احمق ہے کہ کشور کی ایک تصویر بھی اس کے پاس نہیں ہے۔ تصویر ہی کچھ دل بہلاتی۔!

نجمی صاحب اس کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتے رہتے اور اسے سمجھانے کی کوشش کرتے۔

،، تم افسردہ نہ ہو بیٹے۔ اس کا خط ضرور آئے گا۔ آج نہیں تو کل یقیناً آئے گا۔ ہماری زندگی مفروضوں پر ہی قائم ہے۔ فرض کرو کہ تم نے یہ سوچ لیا ہے کہ آج خط آ جائے گا، مگر نہیں آتا۔ تم کل کے بارے میں سوچنا شروع کر دو۔ اس سے فائدہ یہ ہو گا کہ تمہارا آج، آرام سے گذر جائے گا۔ اور تم کل کا انتظار کرتے رہو گے۔ جب کل آئے گی تو تم پرسوں کے متعلق سوچنے لگو۔ اس طرح انتظار کی ذہنی کوفت سے بچ جاؤ گے۔،،

یہ باتیں سن کر پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پیدا ہوئی اور وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ برآمدے سے گذرتے وقت اچانک اسے احساس ہوا کہ کمرے کی پشت والے گھنے باغیچے میں کوئی موجود ہے۔ اس نے ہلکے ہلکے قدم اٹھائے اور آواز پیدا کئے بغیر اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے وہ ان دونوں کو دیکھ سکتا تھا۔ محبوب ایک پہاڑی لڑکی کا ہاتھ پکڑے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"یقین مانو گلبدن ــــ اگر تمہیں میری زندگی سے نکال دیا جائے تو وہ ہوا نکلی ہوئی فٹ بال کی مانند پچک کر رہ جائے گی۔"

"فٹ بال تو میں جانتی ہوں شاب ـ" لڑکی نے جواب دیا۔

"افوہ! ــــ ارے فٹ بال ہی کو نہیں زندگی کو بھی جانو ــــ میرا دل دیکھ رہی ہو۔ یہ کم بخت و بے قرار دل ــ آہ کیا بتاؤں کہ اس دل نے مجھ پر کیا کیا ستم ڈھائے ہیں۔"

"مجھے بتاؤ بابو ــ میں اُشے ضرور اپنے بھائی شے پٹواؤں گی۔" لڑکی نے بھولپن سے کہا۔

"کس کو ــ؟"

"اُشی دل کو، جش نے تم پر شتم ڈھایا ہے۔"

"ہات تیرے کی ــ" محبوب نے اپنی پیشانی پر دو ہنتڑ مارا۔ "ارے میں اس دل کی بات کر رہا ہوں اس دل کی جو یہاں سینے میں دھڑک رہا ہے۔"

محبوب نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا اور ساجد کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"دیکھو ــ دیکھو میری بلبل ــ میری حالت میرے اس شعر سے ظاہر ہے ــ عرض کرتا ہوں۔

میں نے سینے سے لگایا، دل نہ اپنا بن سکا
دل کی جانب تم نے دیکھا دل تمہارا ہو گیا

کچھ سمجھیں —؟"

لڑکی نے معصومیت کے ساتھ نفی میں گردن ہلادی اور اس کے انکار سے محبوب پر بجلی گر پڑی۔ اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے جوشیلے لہجے میں کہنے لگا۔

"افسوس تم کتنی نادان ہو۔ تم شعر کو نہیں سمجھتیں۔"

"اُشکو تو میں جانتی ہوں شاب — اِن پہاڑیوں پر کبھی کبھی آجاتا ہے۔"

"کون —؟" محبوب نے چونک کر پوچھا۔

"شیر اور کون —؟"

"اُفوہ — کہاں پھنس گیا۔" محبوب نے پھر ماتھے پر طمانچہ مارا۔ "کم بخت کچھ بھی تو نہیں جانتی۔ نہ محبت سے واقف ہے نہ پریم سے۔ دل کے بارے میں اسے معلوم ہی نہیں کہ کیا چیز ہوتی ہے؟" اس نے اتنا کہہ کر آسمان کی طرف دیکھا اور گڑگڑا کر بولا۔

"یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھکو زباں اور"

"کیا کشتی سے بات کر رہے ہو بابو —؟" لڑکی نے خود بھی گھبرا کر اوپر دیکھا۔

"کیا کہوں کس سے بات کر رہا ہوں — دیکھو گلبدن، تم میری بات سمجھتی ہو نا —؟"

"تھوڑی تھوڑی — ویسے بابو کہیں تمہیں کوئی دکھ تو نہیں ہے۔؟"

"کیوں نہیں ہے۔" محبوب اس کا ہاتھ اپنے دل پر رکھتے ہوئے بولا — "سینے میں کسک ہے۔ دل میں جلن ہے۔ جگر میں تمہارا تیرِ نیم کش پار ہوا ہے۔ جان

مرغ بسمل کی مانند پھڑپھڑا رہی ہے۔ آہوں کا ایک دھواں ہے جو دل سے اٹھتا ہے اور آنکھوں کے راستے بہنے لگتا ہے۔ کیوں بہنے لگتا ہے، یہ میں تمہیں پھر بتلاؤں گا۔ میرے اس ناتواں دل میں ہزاروں زخم ہیں۔ چھلنی بنا ہوا ہے یہ — لاکھوں داغ ہیں۔ ہائے پھر اپنا ہی ایک شعر پڑھتا ہوں۔

دل کہاں اب جو داغ دکھلاؤں
ہاں وہ اک چیز تھی دکھانے کی

میں — میں تمہیں کیسے بتلاؤں میری بلبل کہ تم نے میرا دل لوٹ لیا ہے۔ چوری کر لیا ہے۔ کیوں کر لیا ہے یہ میں تمہیں پھر......"

محبوب نے اتنا ہی کہا تھا کہ پہاڑی لڑکی نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور اس سے الگ ہٹ کر بولی۔

"کیا کہتے ہو بابو — میں اور چور — تم تو کہتے تھے کہ مجھ سے پریم کرتے ہو، اور اب مجھے چور کہتے ہو — کہتے ہو کہ میں نے دل لوٹ لیا ہے۔ سچ کہتی ہوں میں نے کچھ نہیں لوٹا۔ میں چور نہیں ہوں۔ میں نے کوئی چوری نہیں کی۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ تیزی سے باغیچے کو عبور کر کے نیچے جانے والی پگڈنڈی پر اتر گئی۔ محبوب ارے ارے کہتا رہ گیا اور اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ محبوب ایک ہی مقام پر کھڑا ہوا پیر پٹکتا رہا۔ لیکن اس کی ہمت یہ نہیں ہوئی کہ وہ آگے بڑھ کر اسے روک لیتا۔ شاید اسے یہ خدشہ تھا کہ ساجد یا شمی صاحب اسے دیکھ نہ لیں۔ خود ساجد کا حال یہ تھا کہ اس سے اپنی ہنسی روکے نہ رکی تھی۔ محبوب کی رونی اور مسمسی صورت دیکھ کر جب اس سے ضبط نہ ہو سکا تو اس کے ہونٹوں سے قہقہے اُبل ہی پڑے۔ محبوب نے گھبرا کر پلٹ کے دیکھا۔

"یعنی آپ چھپ کر ہماری راز و نیاز کی باتیں سن رہے تھے۔"

"اماں اسے راز و نیاز کہتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ کیا حماقت تھی؟"
"اسے حماقت نہیں محبت کہتے ہیں۔" وہ ایک آہِ سرد کھینچ کر بولا۔
"مگر وہ تو تم سے روٹھ کر چلی گئی۔"
"اپنا ہی ایک شعر پڑھتا ہوں

برہمی بھی تو ایک تعلق ہے

وہ ہیں ہم سے خفا غنیمت ہے"

"تم کبھی دوسروں کے شعر بھی پڑھتے ہو یا ہمیشہ اپنے ہی اشعار دہراتے ہو!" ساجد نے مسکرا کر پوچھا۔

"دوسرا کون۔؟" محبوب فلسفیانہ انداز میں بولا۔ "دنیا کے تمام شاعر ہر شاعر کے دوست ہوتے ہیں۔ کوئی غیر نہیں سب اپنے ہیں۔ لہذا اشعار میں بھی تیر امیرا نہیں ہونا چاہیئے۔ میرے اشعار کسی اور کے بھی ہو سکتے ہیں اور کسی اور کے اشعار میرے — اسی کا نام اپنائیت ہے۔"

"عجیب منطق ہے تمہاری — میں اگر شاعر ہوتا تو اپنے اشعار کی اس طرح مٹی پلید ہوتے دیکھ کر تم پر دعویٰ دائر کر دیتا۔"

"یار ساجد جان مت جلاؤ اس وقت۔ میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہا ہوں۔" اب کے اُس نے ایک گرم آہ بھری۔ "کیوں تڑپ رہا ہوں۔ یہ میں تمہیں پھر......"

"کہاں تڑپ رہے ہو۔ تم تو اچھے خاصے کھڑے ہو۔" ساجد نے بات کاٹ کر جلدی سے کہا۔

"میرے دل کا خون ہو گیا ہے۔ وہ بغیر مجھے دیکھے ناراض ہو کر چلی گئی ہے — بتاؤ اب میں کیا کروں — کہاں جاؤں۔ کون سے در و دیوار سے جا کر سر پھوڑوں۔"

"اگر اس نے تمہیں مڑ کر نہیں دیکھا تو گھبرانے کی بات نہیں ہے۔" ساجد نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔" اس موقع پر اتفاق سے مجھے بھی ایک شعر یاد آگیا ہے۔ ہے تو کسی اور کا مگر بقول تمہارے اپنا ہی ایک شعر عرض کرتا ہوں۔

جاتے جاتے جو میری سمت نہ دیکھا تو نے

یہی انداز محبت کا پتہ دیتا ہے۔"

شعر سنتے ہی محبوب پھڑک اٹھا۔ چونکہ اس کے مطلب کی بات تھی لہذا بے حد خوش ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا اسے محبت کا سرٹیفکیٹ مل گیا ہے۔ دوڑ کر ساجد سے لپٹ گیا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کمرے میں لے آیا۔ بڑی دیر تک وہ اپنی محبوبہ کی تعریف کرتا رہا۔ اور ساجد کی زبان سے بھی یہ تعریف سننے کا متمنّی رہا۔ ساجد کے مزید دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ وہ مالی کی لڑکی ہے۔ اور اُسے بڑی دقت اور محنت سے اسے شیشے میں اُتارنا پڑا ہے۔ ساجد نے اسے مبارکباد دی اور آرام کرنے کے لئے بستر پر دراز ہوگیا۔

تنہائی پھر ڈسنے لگی۔ تصور اسے پھر کشور کے قریب میں لے گیا۔ گھنٹوں وہ سوچتا رہا کہ آخر اس کا کوئی خط کیوں نہیں آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بیمار ہوگئی ہو اور اسے کاغذ کا ایک ننھا سا پرزہ لکھنے کا وقت بھی نہ ملا ہو۔! اپنی بے بسی پر اس کا دل بھر آیا۔ اور وہ اتنا رویا، اتنا رویا کہ تکیہ بھی اس کے آنسو جذب نہ کرسکا۔

۱۰

وہ نہایت ہی خنک صبح تھی جبکہ وہ مضمحل انداز میں بیدار ہوا۔ پہلے تو اس نے کھڑکی میں سے نظر آنے والے سلسلۂ کوہ کو دیکھنے کی کوشش کی۔ کہر کا دبیز پردہ درمیان میں حائل تھا۔ اس لئے چاندی کے مخروطی پتر ے نظر نہ آتے تھے، پھر اس نے بائیں طرف نجمی صاحب کو کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں کچّے اخروٹ تھے ۔۔۔ "ارے آپ۔" کہہ کر وہ ایک دم اُٹھ گیا۔

"آج تم سیر کو نہیں گئے ۔۔۔؟"

"ہاں ۔۔۔ کچھ کسلمندی غالب تھی ۔۔۔"

"غالبؔ کا جب بھی ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے"

یہ محبوب تھا جو کمبل اوڑھے دانتوں کی جل ترنگ بجاتا ہوا اندر آگیا تھا۔

"آؤ محبوب آؤ ۔۔۔ تم نے اس بار یہ نہیں کہا کہ یہ تمہارا ہی شعر ہے۔" ساجد مسکرایا۔

"ضرورت بھی کیا ہے شعر بلاشبہ میرا ہی ہے۔ ایک زمانے میں میں غالب تخلص کرتا تھا۔ کیوں کرتا تھا یہ میں تمہیں پھر بتلاؤں گا۔"

"محبوب!" نجمی صاحب نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "یوں بلامقصد اور بے موقع مت ٹپکا کرو۔ اور اگر ٹپکا بھی کرو تو آئینہ دیکھ لیا کرو۔ تاکہ تمہاری صورت کا اثر تم پر پڑے کسی اور پر نہیں۔"

"میں نے آپ کی یہ نصیحت گرہ میں باندھ لی ——" محبوب خفیف ہو کر بیٹھ گیا۔

"تم جانتے ہو بیٹے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟" نجمی صاحب نے محبوب کو نظر انداز کر کے پوچھا۔

"جی نہیں تو۔" وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"تمہارے لئے ایک بہت قیمتی چیز لایا ہوں۔"

"کیا؟"

"ارے ظالم! کمرے میں اچانک بھر جانے والی خوشبو سے بھی تم اندازہ نہیں لگا سکتے!"

"خط —— !" بے پناہ اشتیاق کے تحت وہ اچانک بستر سے کھڑا ہو گیا۔ "لائیے!"

"ایک شرط پر —— میں اسے پہلے کھول کر پڑھوں گا، پھر تمہیں دوں گا۔"

"اور سب سے آخر میں مجھے پڑھنے کے لئے دیا جائے گا۔" محبوب بھی بہت بیقرار تھا۔

"مجھے سب منظور ہے۔ ایک ایک شرط منظور ہے۔" اس کی بیتابی دیدنی تھی۔

نجمی صاحب نے خود خط چاک کیا۔ پہلے اسے سونگھا اور پھر کاغذ کی تہیں کھولیں اندر سے گلاب کی سوکھی پتیاں نکلیں۔ یہ پنکھڑیاں انھوں نے ساجد کو دیتے ہوئے خط پڑھنا شروع کیا۔ جتنی دیر تک وہ خط پڑھتے رہے محبوب کی بکواس جاری رہی۔

"یار کمال ہے۔ میں نے رات کو خواب میں ایک شعر کہا اور تفسیر آج صبح مل گئی۔ دیکھو عرض کرتا ہوں۔

اب کے بچھڑے ہیں تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

کیوں کیسا عمدہ شعر کہا ہے۔"

"شعر بیشک اچھا ہے۔" نجمی صاحب نے خط پڑھنے کے بعد ساجد کو دیتے ہوئے کہا۔ "اور شاید احمد فراز نے تم سے ہی ادھار لے لیا ہے۔"

"ممکن ہے۔ ممکن ہے۔ بہت سے شاعر میرے کلام سے استفادہ کرتے ہیں۔ کیوں کرتے ہیں یہ میں آپ کو پھر بتلاؤں گا۔"

نجمی صاحب کے ہونٹ سکڑ گئے اور پھر وہ چند گری ہوئی پنکھڑیوں کو جھک کر اٹھاتے ہوئے ساجد سے بولے۔

"بیٹے تم یہ مت سمجھنا کہ یہ پنکھڑیاں سوکھ گئی ہیں — صندلی ہاتھوں کا مہکتا ہوا لمس ان میں ابھی تک موجود ہے۔ ساتھ ہی وہ الفت بھی جو دکھائی نہیں دیتی بلکہ ان پنکھڑیوں کو چھو کر محسوس کی جا سکتی ہے۔"

نجمی صاحب بالکل درست کہہ رہے تھے۔ ساجد کا رواں رواں محبت کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ان گنت پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ یہ ننھا سا کاغذ کا معطر پرزہ اس کے بے برگ و گل گلشنِ حیات پر کیسی آبیاری کر گیا — ۹ خط میں کشور نے

لکھا تھا:-

میرے ساجد!

تم یقیناً پریشان اور افسردہ ہوگے۔ مگر میں یہاں آکر ٹائی فائیڈ میں مبتلا ہوگئی تھی۔ تمہاری تصویر ایک لمحہ کے لئے بھی میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی۔ جی چاہتا ہے کہ پر لگ جائیں اور میں اُڑ کر وہاں پہنچ جاؤں۔ تمہاری معیت میں گذرے ہوئے لمحات کی یاد میرے لئے سوہانِ روح ہے۔ میں امّی سے تو تمہارا ذکر کر چکی ہوں۔ دیکھو اب ڈیڈی ان کی بات کا کیا جواب دیتے ہیں۔؟ تم فکر نہ کرنا، میں جلد ہی تمہارے پاس ہوں گی۔ جب بھی تمہارے بارے میں سوچتی ہوں، مجھے خود اپنے سے حیا آنے لگتی ہے۔

تمہاری اور ہمیشہ تمہاری کشور

"کیوں ۔۔۔؟ نجمی صاحب نے شوخ نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"بولو حضرت۔ اب تو دل میں لڈو پھوٹ رہے ہوں گے؟" محبوب بھی خوش ہوگیا تھا۔

"مگر پتہ ۔۔۔ اس نے اپنا پتہ تو لکھا ہی نہیں۔؟"

"ہوسکتا ہے کہ اگلے خط میں آجائے۔ لڑکیاں گھروں کے بجائے سہیلیوں کے پتے پر زیادہ خط منگواتی ہیں۔ ممکن ہے کہ جلد ہی وہ کوئی اور پتہ بھیج دے۔"

"مٹھائی پکّی ہوگئی نا ۔۔؟" محبوب نے اپنی جمائی۔

اس نے جواب کچھ نہیں دیا۔ بس خاموشی سے اُٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ ایک چھوٹے سے معطر لفافے نے اس کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کردیا تھا۔

سوکھے دھانوں پر جیسے پانی پڑ گیا ہو۔ کتنا جادو تھا خط کے لفظوں میں! — ساجد نے خود کو پہلے سے زیادہ ہشاش بشاش محسوس کیا اور پھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس کے گالوں کے مرجھائے ہوئے سیب پھر سے تازگی حاصل کر رہے ہیں۔

کاغذی پیرہن کی کشور کو اس نے بارہا اپنے دل اور آنکھوں سے لگایا اور اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے غرض ہر وقت وہ اس خط کو پڑھتا رہا۔ پھر ایک دن ایک عجیب بات ہوئی۔ ایسی بات جس نے اس کے خیالوں کے محل ایک لمحے میں زمیں بوس کر دیئے۔ اس کی امیدوں اور آرزوؤں کے چراغ یک لخت ٹمٹمانے لگے۔ دل ایسے دھڑکا گویا آئندہ کی تمام دھڑکنیں وہ اسی دن پوری کرے گا۔ اس کی ایسی حالت ہوئی کہ پھر دوبارہ پنپنے میں اسے بہت وقت لگا۔

سر بفلک پہاڑوں کی پیشانی پر سیاہ بادل، سیاہ لٹوں کی مانند لہرا رہے تھے۔ ہواؤں میں شدت کے ساتھ ہی ترنم بھی پیدا ہو گیا تھا۔ گہری نیلی جھیل ہلکورے لے رہی تھی۔ ایسے وقت میں وہ نجمی صاحب کے ساتھ اسکیٹنگ ہال کی طرف جا رہا تھا۔ کافی دور آ جانے کے بعد نجمی صاحب کو خیال ہوا کہ کہیں بارش نہ آ جائے۔

"ارے بھئی یہ تو بہت برا ہوا۔ جا نا بیٹے ذرا جلدی سے ایک برساتی اور چھتری لے آؤ۔"

ان کا کہنا مان کر وہ تیزی سے واپس مڑا اور پھر کمرے میں پہنچنے کے بعد دونوں چیزیں نکال لیں۔ واپس ہوتے وقت ابھی وہ آدھے راستے ہی میں تھا کہ اچانک اس کے مستقبل کا خیال کر کے سرمئی بادلوں کی آنکھ سے چند قطرے ٹپک پڑے۔ پھر ہوائیں بھی چیخنے لگیں اور اس نے جلدی سے برساتی اوڑھ کر چھتری بغل میں دبالی۔ اور پھر اپنے دونوں ہاتھ خنک ہواؤں سے بچنے کے لئے برساتی کی جیبوں میں ڈال لیے۔ کھڑ کھڑ کی آواز آئی۔ اس نے محسوس کیا کہ کوٹ کی

جیبوں میں کچھ کاغذ بھرے ہوئے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ مبادا وہ خراب ہوجائیں، اس نے انھیں اونی سوئیٹر کے اندر قمیص کی جیب میں رکھنا چاہا۔ جہاں سے وہ اس وقت گذر رہا تھا، وہاں پر برقی روشنی موجود تھی۔ غیر ارادی طور پر اس نے کاغذ پر نظر ڈالی اور چونک گیا ـــ لکھا تھا ـــ میرے ساجد! تم یقیناً پریشان اور افسردہ ہوگے.....

گھبرا کر اس نے جلدی جلدی وہ خط پڑھ ڈالا۔ خط تو وہی تھا جو کشور نے لکھا تھا البتہ تحریر نجمی صاحب کی تھی۔

اس کی نگاہوں کے سامنے بجلیاں کوند گئیں۔ دماغ کو جیسے کسی نے دو گرتے ہوئے پہاڑوں کے درمیان لاکر رکھ دیا۔ ذہن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اسے محسوس ہوا گویا اس کی روح پر کوئی تازیانے لگا رہا ہے ـــ اُف خدایا! تو کیا وہ خط نجمی صاحب نے لکھا ہے! کیا انھوں نے مجھے بیوقوف بنایا ہے۔؟ میری زندگی سب کے لئے مضحکہ خیز بن گئی ہے۔ سب مجھے بناتے ہیں، سب میری حالت سے لطف اٹھاتے ہیں۔!

بجلی کے کھمبے سے سر لگا کر وہ سسکنے لگا۔ لوہے کے کھمبے سے جب ہوائیں آکر اپنے سر ٹکراتی تھیں تو کھوکھلی سی گونج پیدا ہوتی تھی۔ بالکل ویسی ہی جیسی کہ اس کے دل میں پیدا ہو رہی تھی، نہ جانے کب تک وہ وہاں کھڑا ہوا روتا رہا۔ اور بھیگتا رہا۔ بارش اب اس کی آنسوؤں کی جھڑی سے شرما رہی تھی۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ نجمی صاحب اسے جھنجھوڑ رہے ہیں۔"

"ساجد بیٹے ـــ کیا بات ہے، کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں ـــ کچھ بھی نہیں ـــ" آنسوؤں میں ڈوبا ہوا لہجہ۔

"ساجد!"

اس نے نجمی صاحب کو آنسوؤں کی آبشار کے پیچھے سے دیکھا۔ ان کے ہنستے ہوئے چہرے سے مسکراہٹیں غائب تھیں۔

"میں ایک کھلونا ہوں نا — سب کو حق ہے کہ مجھ سے کھیلیں، آپ کو بھی حق ہے۔" بھرائی ہوئی آواز۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں تم سے کب کھیلا ہوں؟"

اس نے بغیر کچھ کہے ہوئے کاغذ کا وہ پرزہ ان کے آگے کر دیا اور ساتھ ہی چھتری بھی کھول کر ان کی طرف بڑھا دی۔ نجمی صاحب نے وہ پرچہ صرف ایک لمحہ کے لئے دیکھا اور پھر ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس بھر کر بولے:

"ٹھیک ہے، مجھے معلوم تھا کہ ایک دن یہ راز کھل کر رہے گا۔ لیکن بیٹے یقین مانو کہ تمہیں بیوقوف بنانے یا تم سے کھیلنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا میری خطا محض اتنی ہے کہ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا تھا اور بس — تمہیں خوش رکھنے کے لئے مجھے کیا کیا جتن کرنے پڑے، یہ تمہیں کیا معلوم! میں تو اپنے جنگلات کو بھی بھول گیا۔"

"مگر — مگر آپ نے خط ......" ساجد کی آواز بھرا گئی۔

"ہاں یہ خط میں نے ہی لکھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کشور تمہیں خط نہیں لکھے گی۔ مجھے یقین تھا کہ تم بہت بیتابی سے خط کی راہ تک رہے ہوگے، لہذا میں نے خود خط لکھا اور ایک دوست سے اس کی نقل کرا کے تمہیں بھیج دیا۔ ایک تلخ حقیقت کا تم پر آج انکشاف ہو گیا ہے، میں جانتا تھا کہ ایسا ضرور ہوگا۔ مگر بیٹا میں تم سے بار بار کہا کرتا تھا کہ محبت کا کھیل کھیلتے کھیلتے اتنی دور نہ چلے جانا کہ وہاں سے واپس آنا تمہیں دشوار نظر آنے لگے۔ یہ حسین تتلیاں کبھی ایک پھول کی ہو کر نہیں رہتیں۔ مگر تم نے ان کے لئے آہیں بھر بھر کے انھیں اتنا مغرور بنا دیا ہے اور انجام کار اب تم سسک رہے ہو —" وہ رونے لگے۔

"آپ ـــ آپ کیوں رو رہے ہیں ؟" ساجد اپنا رونا بھول گیا۔
"میں نے تمھیں بہت دکھ پہنچایا ہے۔ میں اس حرکت کی معافی مانگ لیتا ہوں۔" انھوں نے ہاتھ جوڑ لئے۔
"ارے ارے ـــ یہ کیا کرتے ہیں آپ ؟" ساجد نے ان کے ہاتھوں کو کھینچ لیا۔
"پھر کیا کروں۔ تم نے میری حرکت کا برا جو منایا ہے۔ حالانکہ وہ محض تمہاری بھلائی کے لئے ہی کیا تھا۔"
"نہیں چچا نہیں ـــ مجھے معاف کر دیجئے۔ میں نے آپ کو غلط سمجھا تھا۔ میں اب آپ ہی کے کہنے پر عمل کروں گا۔"
وہ ان کے سینے سے لپٹ گیا اور پھر بری طرح رونے لگا۔
"بجلیاں کبھی ایک ہی مقام پر نہیں چمکتیں ـــ کبھی ادھر اور کبھی اُدھر ـــ ایسی ہی یہ لڑکیاں ہوتی ہیں۔ میں تم سے آخری بار کہے دیتا ہوں کہ خبردار جو اب کسی کے فراق میں منہ لٹکایا ـــ سمجھے !"
وہ مسکراتا ہوا ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بکھرے ہوئے بادل اب پرسکون ہو گئے تھے۔ ہواؤں کا چیخنا بھی کم ہو گیا تھا۔ گیلی سڑک پر وہ دانستہ قدم نہیں رکھ رہا تھا۔ پہاڑی ٹڈے بارش کے رکتے ہی پھر سے احتجاج کرنے لگے تھے، نجمی صاحب نے چھتری بند کر لی تھی۔ اور اس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے وہ فلیٹ کی سمت بڑھ رہے تھے۔
نجمی صاحب کی بات کا اس نے وقتی طور پر برا مانا تھا۔ مگر پھر ان کے معافی مانگنے کے انداز نے اس کی ساری کوفت بالکل اس طرح دور کر دی تھی جیسے بارش نے کاہی لگے ہوئے پتھروں پر سے برسوں پرانا میل دھو دیا تھا۔

اسے اب محسوس ہو رہا تھا کہ واقعی وہ احمق ہے۔ خواہ مخواہ ایک ذرا سی بات کے لئے خود کو پریشان کر لیتا ہے۔ یہ بات نہیں کہ وہ ہنسنا نہیں جانتا ــــ وہ ہنستا ضرور ہے لیکن اپنی ہنسی اور مسکراہٹوں کو کنجوسی سے استعمال کرنے کا عادی ہے۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں جلد ہی تمہارا علاج کرنے والا ہوں۔" نجمی صاحب نے اچانک کہا۔

"ہاں ــــ لیکن اس سے آپ کا مطلب کیا ہے۔"؟

"تم ناہید کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"ناہید ــــ ہاں وہ ننھی سی ناہید ــــ!"

"تم اسے ننھی سی کہتے ہو۔" نجمی صاحب بری طرح ہنسے۔ "کمال ہے، وہ اب ننھی سی نہیں ہے۔"

"پھر ــــ؟ اس نے حیرت سے بھنویں اچکائیں۔

"وہ اب بی۔ اے کر چکی ہے برخوردار ــــ"

"واقعی! ــــ مگر چچا پہلے تو وہ اتنی سی تھی۔!"

"کوئی بھی انسان ہمیشہ اتنا سا نہیں رہتا۔ وہ اب ایک نوجوان لڑکی ہے اور میرے بھی کان کاٹتی ہے۔"

"کمال ہے۔ مجھے آج تک اس کا خیال نہیں آیا۔ تو آپ نے اس کا ذکر کیوں کیا ہے۔؟"

"وہ یہاں آنے والی ہے۔" نجمی صاحب مسکرائے۔

"واہ ــــ یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔" ساجد نے جھک کر کہا۔ "واقعی میں تو بھول ہی گیا تھا کہ میری ایک چچا زاد بہن بھی موجود ہے ــــ اسے فوراً بلائیے ــــ"

"ساجد ـــــ" نجمی صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس بھری، کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بولے ـ "تم در اصل اپنے ہی غم کو غم سمجھتے ہو، کسی اور کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھتے ـ میری ایک ہی لڑکی ہے مگر میں اسے باپ کا پیار زیادہ نہیں دے سکا ـ وہ گرلز ہوسٹل میں رہتی ہے اور میں یہاں ان جنگلات میں ـ اس کے پاس جا کر یوں نہیں رہتا کہ جنگلات میں صرف ایک دیا سلائی کافی ہوتی ہے ـ اور یہاں میرے جو دشمن ہیں وہ اس موقع کی تاک میں رہتے ہیں ـــــ میں دل پر پتھر رکھ کر یہیں رہتا ہوں اور میرا دل اپنی بچی کو دیکھنے کے لئے ہر وقت تڑپتا رہتا ہے ـ"

"مجھے افسوس ہے چچا ـــــ میری بہت سی باتوں سے آپ کو بے حد تکلیف پہنچی ہے ـ مگر اب میں ایسا نہیں کروں گا ـ میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کروں گا ـ"

"یہ ہوئی نا بات ؟"

"آپ اگر مناسب سمجھیں تو میں ناہید کو جا کر لے آؤں ـ"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے ـ جب وہ یہاں آجائے گی تو بس اسٹاپ سے جا کر لے آنا ـ"

"وہ مجھے پہچان لے گی !"

"کیوں نہیں ـــــ میں خطوط میں تمہارے بارے میں سب کچھ لکھ چکا ہوں ـــــ"

"سب کچھ ـــــ !" ساجد بوکھلا گیا ـ "یعنی میری سب حماقتیں بھی ـ !"

"اب میں تمہاری طرح سے بیوقوف تھوڑی ہی ہوں ـ کشور کے بارے میں تو کچھ نہیں لکھا البتہ زیبا کی موت کا تذکرہ کر دیا تھا ـ اس نے مجھے مشورے

دیئے ہیں کہ میں تمہیں غم زدہ نہ ہونے دوں ۔ مجھے یقین ہے کہ وہ یہاں آتے ہی تمہارے خالات بدل دے گی اور اس کی موجودگی میں تمہاری کھوئی ہوئی مسکراہٹیں واپس آجائیں گی ۔،،

کاش ! ساجد کو علم ہوتا کہ آنے والا زمانہ اس کے دامن میں مسرت و انبساط کے پھول بھر دے گا یا پھر غموں کی چنگاری اسے جھلس ڈالے گی۔!

گھر واپس پہنچنے کے بعد محبوب کے سامنے بھی ناہید کا تذکرہ ہوتا رہا۔ محبوب حسب عادت منھ کھولے ناہید کے بارے میں جاننے کے لئے بیقرار سا رہا۔ جب بھی اس کا نام آتا، محبوب اپنی آنکھیں نچا کر تھوک نگل لیتا۔ نجمی صاحب جب سونے کے لئے چلے گئے تو محبوب نے پوچھا:

"یار ساجد ـــــ اس لڑکی ناہید کو تو نجمی صاحب نے بالکل ہٹلر بنا کر پیش کیا ہے ۔،،

"ہوں ــ،،

"یعنی تم دیکھونا ــ جس انداز سے انھوں نے اس کا تذکرہ کیا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لڑکی ہمیں نچا کر رکھ دے گی اور یقیناً ہم سے پانی بھروادے گی ۔،،

"ہم سے نہیں ــ صرف تم سے ــ،، ساجد نے مسکرا کر کہا۔

"یار میرے تو رونگٹے کھڑے ہونے لگے ہیں ابھی سے۔ میں ایسی لڑکیوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو ہمیشہ احکام دیتی رہیں اور رعونت سے بات کریں۔ کیوں پسند نہیں کرتا، یہ میں تمہیں پھر بتلاؤں گا ......،

"چلو پھر بتلا دینا مگر اب خاموش ہو جاؤ اور مجھے سونے دو ۔،،

ورنہ میں تمہیں سونے سے کب روک رہا ہوں — لیکن یار مجھے تو ان نجمی صاحب نے ڈرادیا ہے۔ اس لڑکی کے سامنے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نکل گئی تو بس سمجھ لو کہ تختہ!"

ساجد نے جواب کچھ نہیں دیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ اس عرصہ میں محبوب ناہید پہ ایک نظم لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ خدا جانے نظم مکمل ہوئی بھی یا نہیں — ساجد تو نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔

۱۱

پھر ایک دن وہ ناشتہ کرنے کے بعد محبوب کو ساتھ لے کر سیر کے لئے نکل گیا۔ ڈاک خانے کے بائیں طرف سے جو سڑک نشیب کی طرف جاتی تھی، وہ اس پر ہولیا۔ محبوب کے دیوتا کوچ کر گئے، کیوں کہ اسے نیچے سے پھر واپس بلندی پر آنا زہر لگتا تھا۔ اچھی خاصی ورزش ہو جاتی تھی۔ ایک بار جیسے ہی بادل کا ایک گہرا ٹکڑا سڑک پہ چھا گیا تو محبوب اس بادل میں روپوش ہو گیا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی ہی تھی کہ ساجد نے اسے پکڑ لیا۔

"کہاں بھاگتے ہو — نیچے آبشار تک چلیں گے۔"

"آبشار کی پھوار میں بھیگنا صحت کے لئے بڑا مضر ہے — کیوں مضر ہے یہ میں تمہیں پھر......"

"مجھے کچھ نہیں سننا۔ جب تم ہر وقت میری دُم میں بندھے رہتے ہو تو اس وقت بھی سہی..."

"مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ میں تمہاری دُم میں بندھا رہتا ہوں —

دم والے جانور مجھے بہت پسند ہیں۔۔۔اب میں ضرور چلوں گا۔"

ساجد زیر لب مسکرا دیا اور پھر وزن تولتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ سڑک کے بائیں طرف کے کھڈوں میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اور اس تاریکی میں نشیب میں بہنے والی ندی اوپر سے یوں دکھائی دیتی گویا کوئی روپہلا سانپ لہراتا ہوا جا رہا ہے۔ محبوب دل پر جبر کرکے اتر رہا تھا۔ اچانک انھیں بلندی پر سے کوئی آبشار کے دامن میں نہاتا ہوا دکھائی دیا۔ دودھ جیسے جسم نے یہ راز کھول دیا تھا کہ وہ دراصل کوئی پہاڑی دوشیزہ ہے۔ محبوب کی باچھیں کھل گئیں۔ جو قدم پہلے بادلِ نخواستہ اٹھ رہے تھے اب جلدی جلدی آگے پڑنے لگے۔ پہاڑی لڑکی نے جب دو آدمیوں کو نیچے آتے دیکھا تو اس نے فوراً کپڑے پہن لئے۔ اور ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر اپنے پیر پانی میں پڑے رہنے دیئے۔ جب وہ دونوں نیچے پہنچے تو لڑکی کی پشت ان کی طرف تھی۔

"میاں خدا کی قسم کیا چیز ہے۔۔۔یعنی تم نے دیکھا۔۔۔" محبوب ساجد کا ہاتھ دبا کر بولا۔

"دیکھ رہا ہوں۔۔۔مگر اس لڑکی سے زیادہ حسین یہ منظر ہے۔"

"اور تم نے اس کا چاندی سا بدن بھی دیکھا تھا۔"

"وہ بھی دیکھا تھا مگر اتنی بلندی سے گرتی ہوئی تم یہ چاندی کی دیوار دیکھ رہے ہو۔ یہ کتنی عمدہ ہے۔؟"

"یار تم تو ہر وقت مناظر میں ہی کھوئے رہتے ہو۔ خدا کی بنائی ہوئی یہ مخلوق بھی دیکھو۔"

"مناظر بھی دیکھنے کے لئے ہیں اور انھیں بھی خدا نے بنایا ہے۔" ساجد نے ٹکرا توڑ کر جواب دیا۔

"کم بخت کس انداز سے بیٹھی ہوئی ہے۔ اس موقع پر مجھے اپنا ہی ایک شعر یاد آرہا ہے۔

سنہری پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے
شفق نے تم کو نہ جانے کتنی بار دیکھا ہے۔"

"شفق نے تم کو سرِ جوئے بار دیکھا ہے۔" ساجد نے تصحیح کی۔

"تم نے میرے دیوان میں پڑھ لیا ہوگا — میں نے واقعی غلط پڑھا تھا۔ کیوں غلط پڑھا تھا۔ یہ میں تم کو......"

"بتانے کی ضرورت نہیں، فیض کی زبان سے میں نے اس مصرعے کو اسی طرح سنا ہے۔"

"ہاں ہاں ممکن ہے —" محبوب نے جھینپ کر جواب دیا۔ "فیض کو میرا دیوان بہت پسند تھا۔ انھوں نے غالباً یہ شعر مستعار لے لیا ہے۔"

لڑکی ان کی باتوں سے بے پروا، خاموش بیٹھی ہوئی پانی میں پیروں سے چھپاکے اڑا رہی تھی۔ جوں ہی اس نے مڑکر محبوب کو دیکھا وہ ہڑبڑا کر خود بھی پانی میں گرتے گرتے بچا۔

"ارے تم۔ یعنی تم —"

"کیا نہانے آئے ہو بابو —" محبوب کی چہیتی محبوبہ نے اٹھلا کر پوچھا۔

"نہیں جی — یہ خودکشی کرنے آئے ہیں۔" محبوب کی بجائے ساجد نے جواب دیا۔

"اماں یار ساجد — کیا کر رہے ہو۔؟" محبوب گڑبڑا گیا۔

"وہ کیا ہوتی ہے بابو —؟" محبوبہ گلبدن نے حیرت سے پوچھا۔

"ملاپ کو کہتے ہیں ملاپ کو —" محبوب نے ساجد کو ایک ہاتھ سے پیچھے

دھکیلتے ہوئے کہا۔ "تم مجھ سے روٹھ گئی تھیں نا۔ اب میں تمہیں منانے آیا ہوں۔"

گلبدن پتھر پر سے اُٹھ کر دونوں ہاتھوں سے لہنگا اٹھائے، سفید سے کی خوبصورت شاخوں جیسی پنڈلیوں کی نمائش کرتی ہوئی ان کی طرف بڑھی۔ محبوب بڑا پریشان تھا۔ ساجد کی موجودگی میں وہ کھل کر محبوبہ سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ اور ساجد ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ جب اس نے بڑی منت سماجت کی، ہاتھ جوڑے تو ساجد انھیں وہاں تنہا چھوڑ کر، آبشار کی دوسری طرف چلا گیا۔ جہاں پانی گرتا تھا وہاں چھوٹے چھوٹے مگر کم گہرے گڑھے تھے۔ چمکیلے پتھروں پر بڑی احتیاط کے ساتھ پاؤں رکھتا ہوا جب وہ اس جگہ پہنچا تو بڑے بڑے کیکڑے تلملا کر وہاں سے بھاگے۔ اس نے جھک کر چند کیکڑوں کی ٹانگیں پکڑ لیں اور انھیں پانی سے باہر نکال کر رومال میں باندھ لیا۔ پھر وہیں آبشار کے نیچے سے اس نے لاتعداد سفید رنگ کے گول چمکیلے پتھر اکٹھے کر کے اپنی جیبوں میں بھر لئے۔ کنکھیوں نے اس نے محبوب کو محوِ اختلاط دیکھ لیا اور دانستہ دیر تک اسی مقام پر رکا رہا۔ محبوب کو اس بات کا بے حد افسوس تھا کہ اس کی محبوبہ گلبدن کو ساجد نے بالکل عریاں دیکھ لیا ہے۔ اور اب جبکہ وہ قریب ہی کھڑا ہوا اس کے سینے پر مونگ دل رہا تھا۔ وہ غصے سے لگاتار پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

"یار ساجد، تم چلو اوپر میں آجاؤں گا ـــــ" اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"جلدی کیا ہے، ساتھ ہی چلیں گے۔"

"اب میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں ـــــ یار کیوں کباب میں ہڈی بن رہے ہو؟"

"مجھے آبشار کی یہ پھواریں بڑی اچھی لگ رہی ہیں۔" ساجد نے ہنس کر جواب دیا۔

"اور مجھے تمہاری یہ ہنسی اس وقت زہر لگ رہی ہے۔ کیوں لگ رہی ہے۔ یہ میں تمہیں پھر بتلاؤں گا۔"

ساجد پھر بھی ڈھیٹ بنا کھڑا رہا اور جب محبوب نے دیکھا کہ وہ ٹس سے مس ہی نہیں ہوتا تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر ملتجیانہ نظروں سے اسے دیکھا اور تب ساجد اس کا قصور معاف کر کے مسکراتا ہوا واپس ہولیا۔ پھوار سے بچنے کے لئے محبوب نے چھتری کھول لی تھی۔ چھتری درحقیقت ساجد کی تھی اور چلتے وقت محبوب نے اسے احتیاطاً اٹھا لیا تھا۔ ساجد نے کنکھیوں سے دیکھا تو اب محبوب نے چھتری کا پردہ درمیان میں قائم کر لیا تھا۔

ایسے دلچسپ موقع کو ساجد اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ وہیں ایک بڑے سے پتھر کے پیچھے چھپ کر محبوب کی باتیں سننے لگا۔ محبوب کہہ رہا تھا۔

"تمہاری یہ دمکتی ہوئی صورت دیکھ کر مجھے وہ برفانی چوٹیاں یاد آجاتی ہیں۔ گلبدن، جو بالکل تمہارے حسین چہرے کی طرح چمکتی ہیں۔ کیوں چمکتی ہیں۔ یہ میں تمہیں ....."

"ایسا کس طرح ہو سکتا ہے بابو؟" گلبدن نے اُن کی بات کاٹ دی۔

"تمہارا قد — ہائے تمہارا یہ قد سچ مانو چیڑ کے درختوں کو شرماتا ہے۔ تمہاری ہنسی میں وہ ترنم ہے جو اس آبشار میں نہیں ہے — تمہاری زلفوں میں وہ مہک ہے جو یہاں کی ہواؤں میں نہیں ہے۔ ان زلفوں ہی سے ہواؤں نے خوشبو چرائی ہے۔"

"کیا پھر کسی نے کوئی چیز چرائی بابو۔۔۔"

"ارے معصوم قاتل ۔۔ تو کیوں میرے ارمانوں پر اوس ڈالے جا رہا ہے؟"

محبوب کے اتنا کہتے ہی گلبدن نے جلدی سے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔

"کون جا رہا ہے۔؟"

"کوئی نہیں جا رہا ۔۔۔ میرا دل میرے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے ۔۔۔ تم اتنی بھولی کیوں بنتی ہو گلبدن۔ دیکھو ۔۔۔ دیکھو تم میری ہو ۔۔۔ ہو نا ۔۔۔"

"ہاں بابو میں تمہاری ہوں ۔۔۔"

"واہ جی خوش ہو گیا ۔۔۔ اچھا یہ دودھ میں نہایا ہوا جسم کس کا ہے؟"

"تمہارا ہے بابو اور کس کا ۔۔۔؟" گلبدن نے اس کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ حسین کٹورے جیسی آنکھیں کس کی ہیں۔؟" محبوب نے اس کی جذبات سے مغلوب نیم وا آنکھوں کو انگلی سے چھوتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری ہیں بابو اور کس کی؟"

"یہ زلفیں، یہ لہراتی ہوئی معطر زلفیں۔ یہ بید مجنوں جیسی سبک باہیں کس کی ہیں؟"

"تمہاری ہیں بابو تمہاری ہیں ۔۔۔" گلبدن نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"یہ آبشار، یہ پہاڑ، یہ گھاٹیاں کس کی ہیں؟" محبوب نے اب فطرت پر بھی قبضہ جمانا شروع کر دیا۔

"تمہاری اور صرف تمہاری۔" جواب آیا۔

"یہ چاندی کے کمرے، یہ خوبصورت لباس کس کا ہے؟" محبوب نے

اب خود بھی آنکھیں بند کرلیں۔

"تمہارا بابو — صرف تمہارا۔" گلبدن نے سرگوشی میں کہا۔

"یہ چٹان جس پر ہم بیٹھے ہیں ......"

محبوب اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ساجد گھبرا کر پتھر کے عقب سے نکلا اور اس کے سامنے پہنچ کر بولا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں، خواہ پوری دنیا تمہاری ہو جائے، لیکن معاملہ جب اس چھتری تک پہنچے تو براہ کرم یاد رکھنا کہ وہ میری اور صرف میری ہے۔"

وہ دونوں جلدی سے گھبرا کر علیحدہ ہو گئے اور شرمندگی کے ساتھ ساجد کو دیکھنے لگے۔ ساجد نے کچھ نہیں کہا بس جلدی سے اپنی چھتری محبوب کے ہاتھ سے چھینی، اسے ایک فرشی سلام کیا اور تقریباً بھاگتا ہوا اوپر جانے والی پگڈنڈی کی طرف بڑھ گیا۔

یہ وہی تو ساجد تھا جس کے صبح و شام آہیں بھرنے ہی میں گذرتے تھے۔ مگر اب اس کی کایا پلیٹ ہو رہی تھی۔ بذلہ سنجی پھر سے عود کر آئی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اسے اس طرح ہنسانے میں نجمی صاحب کا بہت بڑا ہاتھ ہے — خدا انھیں بھی ہمیشہ خوش رکھے۔!

۱۲

بنگلے پر پہنچا تو پتہ چلا جیسے کوئی طوفان آیا ہوا ہے۔ نجمی صاحب ملازموں کو ہدایات دے رہے تھے۔ اور کمروں کے سامان میں ردّ و بدل ہو رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی انھوں نے ایک تار اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور پھر احکام دینے

میں مصروف ہو گئے۔ ساجد نے تار پڑھا۔ ناہید کا تھا اور وہ اسی دن صبح گیارہ بجے بس کے ذریعے پہنچنے والی تھی۔ تب ساڑھے دس بجے تھے اور ناہید آدھ گھنٹے کے اندر پہنچنے ہی والی تھی۔

"یار ساجد بیٹے ـــ" تجمی صاحب کے گفتگو کے انداز سے ہی ان کی دلی مسرت ظاہر ہوتی تھی۔ "کیا ہی اچھا ہو کہ تم اسے خود جا کر لے آؤ۔ دیکھنا کہ وہ تمہیں پہچانتی ہے یا نہیں؟"

"آئیڈیا تو برا نہیں ہے چچا ـ میں ابھی چلا جاتا ہوں۔"

"بالکل۔ بالکل۔ اتنے عرصے میں تمام کمروں کی صفائی بھی ہو جائے گی۔"

کچھ ہی دیر بعد ہونے والی انوکھی ملاقات کے تصور سے ہی ساجد کے انگ انگ سے مسرت پھوٹی پڑتی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ دانستہ ناہید کو نظر انداز کر دے گا اور جب وہ گردن اونچی کر کے بار بار ادھر ادھر دیکھے گی تو پھر اس کی حالت سے لطف اندوز ہو گا۔ لیکن جب بس اسٹاپ پر پہنچ کر اسے یہ علم ہوا کہ ناہید والی بس شام تک بھی غالباً نہ آ سکے گی تو اس کی سب خوشی دھری کی دھری رہ گئی۔ دفتر والوں نے اسے بتایا تھا کہ ایک میل نیچے جا کر سڑک پر ایک کچّا پہاڑ آ پڑا ہے اور سڑک عارضی طور پر بند ہو گئی ہے۔ سڑک کے دوسری طرف جو ٹریفک رکا ہوا ہے وہ جب تک کہ سڑک بن نہیں جاتی وہیں رکا رہے گا۔

"مگر صاحب اس جگہ تک جانے کا کوئی راستہ بھی ہے۔" ساجد نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ہے تو مگر وہ کچّی سڑک ہے جو بائیں طرف سے گھوم کر نیچے جاتی ہے۔ اور پھر چار میل کا چکر کاٹ کر اچھی سڑک سے مل جاتی ہے ـــ" دفتر والوں

جواب دیا۔

"تو کیا بس اس کچی سڑک سے نہیں آسکتی۔؟"

"نہیں صاحب — وہ سڑک بس کے لئے نہیں ہے — کیا آپ کی کوئی سواری آنے والی ہے۔؟"

"ہاں — میری بہن ابھی بس سے آرہی ہے۔"

"تو پھر آپ ایسا کیجئے کہ کچی سڑک کے ذریعے نیچے اتر جائیے، ایک ڈیڑھ میل کے بعد آپ کو ایک پگڈنڈی ملے گی جو نشیب میں اتر کر پھر اوپر جاتی ہے اور اصلی سڑک سے مل جاتی ہے۔ آپ پیدل وہاں تک جا سکتے ہیں —"

بات ساجد کی سمجھ میں آگئی اور وہ کچے راستے پر ہو لیا۔ بار بار وہ نشیب میں دیکھتا جارہا تھا کہ کہیں پگڈنڈی نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ مشکل سے وہ دو یا تین فرلانگ نیچے اترا ہوگا کہ اسے ایک موڑ پر ایک جیپ کھڑی نظر آئی۔ موڑ پہ سڑک بہت تنگ ہو جاتی تھی اور جیپ اس طرح کھڑی ہوئی تھی کہ ساجد کوشش کے باوجود دوسری طرف نہیں جا سکتا تھا۔ صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ ڈرائیور کی سیٹ پر سے گذرتا ہوا دوسری سمت کود جائے۔ مگر فی الحال یہ طریقہ بھی مشکل تھا۔

ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر ایک بے حد حسین و جمیل لڑکی بیٹھی ہوئی اسے گھور رہی تھی۔ ڈرائیور البتہ موجود نہیں تھا۔ لڑکی کو غالباً یہ احساس ضرور تھا کہ یہ اجنبی شخص اس کی جیپ کے راہ میں حائل ہو جانے کے باعث آگے نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بار بار بے چینی سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی —

"محترمہ — معلوم ہوتا ہے کہ یہ سڑک آپ کی بنوائی ہوئی ہے۔" ساجد کو اچانک غصہ آگیا۔

لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لگاتار بےچینی سے پہلو بدلتی رہی۔

"اگر آپ نیچے اتر آئیں تو میں جیپ کے اندر سے ہوتا ہوا دوسری طرف نکل جاؤں۔"

لڑکی اب بھی چپ رہی۔ ساجد کو اور طیش آگیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ بینائی کے ساتھ ساتھ آپ کی سماعت بھی کمزور ہے۔" ساجد نے دیکھ لیا تھا کہ لڑکی عینک لگائے ہوئے ہے۔

"آپ عجیب انسان ہیں۔ آپ سے صبر نہیں ہو سکتا۔؟"

"نہیں ہو سکتا۔ مجھے جلد سے جلد دوسری طرف پہنچنا ہے۔"

"جیپ میں پٹرول ختم ہو چکا ہے۔ پٹرول آجائے تبھی یہ اپنی جگہ سے ہٹ سکتی ہے۔"

"اوہ — تو یوں کہیے کہ ڈرائیور پٹرول لینے گیا ہوا ہے۔" ساجد نے ہونٹوں سے سیٹی بجاتے ہوئے کہا۔ "خیر تو آپ نیچے اتریئے تاکہ میں دوسری طرف اتر جاؤں۔"

"میں نیچے نہیں اتروں گی۔"

"کیوں، کیا میں آپ کو کھا جاؤں۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تمیز سیکھی ہی نہیں۔ خواتین سے کس طرح گفتگو کرنی چاہیئے، آپ جانتے ہی نہیں۔" لڑکی نے منہ بنا کر کہا۔

"اچھا۔ تو آپ خاتون ہیں!" ساجد طنز بہ انداز میں بولا "میں معافی چاہتا ہوں خاتون اور گذارش کرتا ہوں کہ آپ نیچے تشریف لے آئیں تاکہ خادم اس طرف جا سکے۔"

لڑکی جز بز ہو کر جلدی سے نیچے کودی اور پھر ساجد اسے دیکھتا ہوا جیپ کی اگلی سیٹوں سے گذرتا ہوا دوسری طرف پہنچ گیا۔ وہاں جا کر اس نے ایک فرشی سلام کیا جس کا جواب لڑکی نے شانے جھٹک کر اور گردن موڑ کر دیا۔ ساجد بار بار اسے مڑ کر دیکھتا ہوا، مسکراتا اور سلام کرتا ہوا آگے بڑھ گیا اور وہ لڑکی اسے اس طرح گھورتی رہی گویا کچا ہی چبا جائے گی۔

کچھ دیر بعد وہ اس مقام پر آگیا جہاں سے ایک پگڈنڈی نشیب میں اتر کر پھر دوسری طرف چڑھ جاتی تھی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے دیکھا کہ پہاڑی قلیوں نے ٹوٹ کر گرا ہوا کچا پہاڑ اب سڑک پر سے صاف کر دیا ہے اور رکی ہوئی بسیں اب دھیرے دھیرے چلنی شروع ہو گئی ہیں۔ اس نے پھر بھی مناسب سمجھا کہ گھاٹی میں اترنے کے بجائے واپس بس اسٹاپ پر ہی چلا جائے۔ اس طرح وہ جلد از جلد وہاں پہنچ سکتا ہے۔ جب وہ اس موڑ پر آیا جہاں جیپ رکی ہوئی تھی تو اس کے لبوں پر کچھ دیر پہلے کی لڑائی کے تصور سے مسکراہٹ پھیل گئی۔ جیپ اب وہاں موجود نہیں تھی اور ظاہر ہے کہ آگے جا چکی تھی۔

بس اسٹاپ پر اس نے معلوم کیا مگر ناہید کا کچھ پتہ نہ چل سکا اور پھر اسے یقین ہی کرنا پڑا کہ وہ اس بس سے ہرگز وہاں نہیں آئی اور عین ممکن ہے کہ کسی دوسری بس سے آنے والی ہو۔ یہ خبر جج صاحب کو دینی بھی ضروری تھی لہذا وہ واپس بنگلے کی طرف مڑ گیا۔ جلد سے جلد پہنچنے کے لئے اس نے وہ چھوٹا سا راستہ اختیار کیا جو مین گیٹ پر نہیں بلکہ بنگلے کے عقب والے چھوٹے سے باغیچے میں پہنچتا تھا۔

۱۳

خلافِ توقع بنگلے میں خاموشی تھی۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہ سب سے پہلے زماں پر پڑی۔ وہ نجمی صاحب سے بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا۔ محبوب اس وقت موجود نہیں تھا۔ جب ساجد نجمی صاحب کے قریب جاکر بیٹھ گیا تو زماں نے خلافِ معمول بڑی محبت اور اخلاق سے اسے مخاطب کیا۔

"کہیئے کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

"شکریہ! اچھا ہوں۔" اسے دیکھتے ہی ساجد کے زخم ہرے ہو گئے اور اس نے پژمردہ لہجے میں جواب دیا۔

"بہت دنوں سے آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"جی ہاں — ذرا مصروف تھا۔" رسمی طور پر اس نے کہا۔ "ناہید اس بس سے نہیں آئی چچا۔"

"اچھا۔!" نجمی صاحب کے لہجے میں حیرت کم اور مسرت زیادہ تھی۔

"سڑک پر پہاڑ گر گیا ہے اور بسیں اس کی وجہ سے رک گئی تھیں۔ جب راستہ صاف ہوا تو بسیں یہاں اڈے پر پہنچیں۔ میں نے دیکھ لیا مگر وہ کہیں موجود نہیں تھی۔"

"اچھا۔!" نجمی صاحب نے پھر اس کا تمسخر اڑایا۔

"کیا بات ہے۔ آپ کو حیرت نہیں ہوئی؟"

"ہاں ـــ اس لئے نہیں ہوئی کہ ناہید یہاں آچکی ہے۔" وہ بچوں کی طرح ہنستے ہوئے بولے۔ "بیٹھے رہو، وہ لباس تبدیل کر کے ابھی یہاں آنے والی ہے۔"

ساجد کو تعجب بھی ہوا اور پریشانی بھی۔ آخر جب سبھی راستے بند تھے تو وہ کس طرح یہاں پہنچ سکتی ہے۔؟ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازوں پر گرے ہوئے پردوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ اور ایک معطر جھونکا اس کے قریب سے ہو کر گذر گیا۔ اس نے جلدی سے اس طرف دیکھا اور پھر گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ جتنی حیرت اسے تھی شاید اس سے کہیں زیادہ ناہید کو تھی۔ وہ بھی وہیں ٹھٹھک کر اسے دیکھنے لگی۔ ساجد نے اچانک بری طرح ہنسنا شروع کر دیا اور پھر فوراً صوفے پر بیٹھ گیا۔ نجمی صاحب اور زماں حیرت سے کبھی اُسے دیکھتے اور کبھی ناہید کو دیکھ رہے تھے۔ جواب خود بھی مسکراتی ہوئی کرسی پر آہستہ سے بیٹھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے بھئی۔ یہ کیا قصہ ہے؟" نجمی صاحب نے پوچھا۔

"ہم دونوں پہلے ہی ایک دوسرے سے مل چکے ہیں چچا۔ اور ہماری دو دو چونچیں بھی ہوئی تھیں۔"

اس کے بعد ساجد نے پورا واقعہ انھیں سنا دیا اور پھر کمرے میں

مسلسل فلک شگاف قہقہے کچھ دیر تک گونجتے رہے۔

"میں نے آپ کا بہت لحاظ کیا تھا ورنہ سچ مجھے بڑا غصہ آگیا تھا۔" ناہید نے مسکرا کر کہا۔

"تو تم غصے میں کیا کر لیتیں میرا۔"

"زماں صاحب آجاتے تو ان سے پٹواتی۔" ناہید ہنسنے لگی۔

"زماں صاحب!" ساجد نے جلدی سے زماں کو دیکھا۔ "یعنی وہ ڈرائیور کی سیٹ پر زماں صاحب!"

"ہاں — یہی تو مجھے یہاں تک لائے ہیں۔"

"بھئی زماں — تمہارا شکریہ بار بار ادا کرنے کو دل چاہتا ہے۔" نجمی صاحب ریشہ خطمی ہوئے جا رہے تھے۔

"مجھے شرمندہ نہ کیجئے، یہ تو میرا فرض تھا۔" زماں نے تشکرانہ لہجے میں جواب دیا —

اور پھر نجمی صاحب سے اسے یہ معلوم ہوا کہ سڑک پر پہاڑ گر جانے کے باعث زماں کو ہی وہاں معائنہ کے لئے پہنچنا پڑا۔ پہاڑی سڑکیں اسی کی زیر نگرانی بن رہی تھیں۔ ناہید پریشانی کے عالم میں بس سے باہر کھڑی اپنے ہونٹ چبا رہی تھی اور جب زماں کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ کون ہے اور کہاں جانا چاہتی ہے تو زماں نے مزدوروں کو ہدایتیں دینے کے بعد یہ پیش کش کی کہ وہ فوراً ہی دوسرے راستے سے اسے بنگلے پر پہنچا سکتا ہے۔ اسے ایسا کر کے خوشی اس لئے بھی ہوگی کہ نجمی صاحب اور ساجد سے اس کے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ ناہید راضی ہو گئی تھی اور پھر زماں اسے جیپ میں بٹھا کر دوسرے راستے سے یہاں لے آیا تھا۔

ساجد پوری داستان سن کر بڑی دیر تک ہنستا رہا تھا۔ پھر زماں معذرت

چلا گیا وہاں سے چلا گیا تو نجمی صاحب نے کچھ خاندانی باتیں چھیڑ دیں۔ اور جب یہ باتیں بھی ہو گئیں تو ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ کھانا لگا دیا گیا ہے۔ کھانے کے دوران میں وہ اسے بغور دیکھتا رہا۔ ویسا ہی جسم، وہی رنگت، وہی شوخی، ویسی ہی آواز، وہ بہت حد تک زیبا سے مشابہ تھی۔ ہاں البتہ اس کی آنکھیں زیبا کی آنکھوں سے بڑی اور زیادہ خوبصورت تھیں ـــــ اور ان آنکھوں کا حسن بے حد خوب صورت عینک نے اور دوبالا کر دیا تھا۔ اسے تعجب ہوا کہ یہ وہی ناہید ہے ـــــ وہی ضدی سی بے وقوف لڑکی جس کے ساتھ وہ بچپن میں بارہا کھیلا تھا ـــــ اس میں اتنی تبدیلی کس طرح ہو گئی؟

کھانے پر کچھ زیادہ باتیں نہیں ہوئیں۔ بس ناہید اسے دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی۔ اور وہ بھی دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا کہ اسے زیبا کا نعم البدل مل گیا ہے۔

سہ پہر کے وقت محبوب صاحب بھی نازل ہو گئے اور ناہید کو دیکھ کر بھونچکے رہ گئے۔ رعب حسن نے اس کے قدموں کو جکڑ کر رکھ دیا۔ ناہید نے صرف ایک نظر غلط انداز اس پہ ڈالی اور پھر اپنا سامان درست کرنے میں مصروف ہو گئی ـــــ اور اس ایک نظر نے اسے ڈگمگا دیا۔ اور پھر تیزی سے وہ ساجد کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

ساجد باغ میں بیٹھا ہوا ایک خوبصورت سی تتلی کو ہلکے گلابی پھول کا رس چوستے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اچانک نجمی صاحب محبوب کے ہمراہ وہاں آئے اور بولے۔

"بھئی کہاں ہو تم ـــــ آخر اس سے چھپتے کیوں پھر رہے ہو۔؟"

"یہ بات نہیں چچا ذرا شرمندگی حاوی ہے۔ ویسے میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ ذرا وہ آرام کر لے، پھر اس کی خبر لوں گا۔"

"اچھا اچھا ـــــ یہ بات ہے۔" نجمی صاحب نے قہقہہ لگایا ـــــ "اچھا آؤ

اب اندر چلو، وہ تمہیں یاد کر رہی ہے۔"

"آپ چلیئے، میں لباس تبدیل کر کے آتا ہوں۔"

نجمی صاحب چلے گئے تو محبوب نے کہا۔

"یار خواہ مخواہ ہی ڈرا دیا تمہارے چچا نے ـــ کہہ رہے تھے نا کہ ہٹلر ٹائپ لڑکی ہے ـــ مگر یہ تو کچھ بھی نہیں ـــ بولتی ہی نہیں، کوئی بات کرو تو گھورنے لگتی ہے۔ کیوں گھورنے لگتی ہے یہ میں نہیں...."

"تم بھی وہیں چل کر بیٹھو۔ میں آتا ہوں۔" ساجد اتنا کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ جب ساجد محبوب کے ساتھ اندر پہنچا تو وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھو ناہید۔ کھڑی کیوں ہو گئیں۔؟"

"بہرحال آپ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں ـــ" اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ ساجد آہستہ سے ہنسا اور پھر اس کے قریب والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ محبوب حسب عادت منہ کھولے اور ٹکٹکی لگائے ناہید کو گھور رہا تھا۔ ساجد محسوس کر رہا تھا کہ وہ محبوب کی اس حرکت سے کچھ پریشان سی ہے۔

"یہ میرے نالائق دوست محبوب علی مجذوب ہیں ـــ" ساجد نے تعارف کرایا۔

"مجذوب ـــ" ناہید ہنسی ـــ "وہ تو ان کے حلیے سے ظاہر ہے۔"

"ویسے یہ اس ٹائپ کی چیز ہیں کہ ان کی کسی بات اور حرکت کا برا ماننا ضروری نہیں ہے۔"

"مجھے احساس ہے۔"

"مگر ناہید، سچ کہتا ہوں وہاں موڑ پر مجھے یقین ہی نہیں آسکتا تھا کہ تم ناہید ہو سکتی ہو۔"

"میں نے بھی تو آپ کو برا بھلا کہا تھا ــــ معافی چاہتی ہوں۔" اس کی نگاہیں جھک گئیں۔

"ساجد زبان کا کڑوا سہی مگر دل کا برا نہیں ہے۔" محبوب اپنے حواس مجتمع کرکے بولا۔ "یہ آپ کو ضرور معاف کردیں گے۔ کیوں ساجد؟"

"ہاں مجھے ایسا کرنا تو چاہیئے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"تمہیں یاد ہے ناکہ میں نے تمہیں اپنا ایک شعر سنایا تھا۔ نہیں سنایا تھا تو اب سناتا ہوں۔ عرض کرتا ہوں۔

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی"

ناہید نے کمان جیسی بھنویں اوپر اٹھائیں اور پہلے حیرت سے محبوب کو دیکھا پھر ساجد کو۔

"حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" ساجد نے مسکرا کر کہا۔ "مرزا غالب تے ان کے دیوان سے یہ شعر آج سے ستر سال پہلے چرا لیا تھا۔"

بڑے قہقہے لگے اور ان قہقہوں کی شدت نے نجمی صاحب کو بھی دوسرے کمرے میں سے گھسیٹ لیا۔ اور پھر انھوں نے بھی بڑی شد و مد کے ساتھ ان قہقہوں میں حصہ لیا ــــ

"دیکھا تم نے ــــ میں نے تم سے غلط تو نہیں کہا تھا ــــ" نجمی صاحب نے ساجد سے کہا۔ "یہ تمہیں بری طرح ہنساتی رہے گی۔"

"میں آپ دونوں کا احسان مند ہوں۔ ناہید کی آمد نے زیبا کا پیدا کردہ خلا پر کردیا ہے۔ میں جس خواہرانہ محبت کے لئے اب تک سرگرداں تھا، وہ مجھے مل جائے گی ــــ مل جائے گی نا ناہید۔؟"

ناہید نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر بے چینی سے پہلو بدلا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں ــــ کیوں نہیں ــــ" ناہید کے بجائے نجمی صاحب نے جواب دیا۔

"آپ مجھے کچھ بھی سمجھیں، مگر میں آپ کو بھائی نہیں سمجھ سکتی۔" ناہید نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا کہہ رہی ہو بیٹی؟" نجمی صاحب نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

وہ خاموش رہی اور اپنے ناخن سے بید کی کرسی کو خواہ مخواہ کھرچنے لگی۔ وہ تینوں اسے تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ہاں ابّا جی ــــ اگر میں انھیں بھائی سمجھوں گی تو بچپن کی ایک ایک بات کا گن گن کر بدلا لیں گے۔"

قہقہے پھر بلند ہوئے اور ساجد کے چہرے پر پھیلی ہوئی افسردگی ایک لمحہ میں دور ہو گئی۔ اس نے قہقہے کے بجائے صرف مسکرانے پر اکتفا کی۔ نجمی صاحب بھانپ گئے اور اس کے کان کے قریب منھ لے جا کر بولے۔

"اس کی باتوں کا تم نے برا مانا تو بہت بڑی غلطی کرو گے۔ اس کا دماغ بہت خراب ہے اور یہ پرلے درجے کی خوشامد پسند ہے۔ یہ پھولوں کی بہت دلدادہ ہے۔ تم اسے یہ پھول دے دو جو تم باغ میں سے توڑ کر لائے ہو۔"

"ابا جی!" ناہید جلدی سے بولی ــــ "مجھے یہ مکھیوں کی طرح باتیں کرنا قطعی پسند نہیں ہے۔"

"جی ہاں یہ بہت بری عادت ہے۔ خود میرا بھی ایک شعر ہے۔

خموشی کی زباں مجذوب کوئی ہم سے گر سمجھے
اگر سمجھے تو یہ سمجھے کہ ہم بالکل نہیں سمجھے " کرتا

محبوب کو کچھ نہ کچھ بولنا تھا لہذا بے موقع ہی سہی، وہ بول ضرور دیا۔ ناہید نے پھر ایک حیرت زدہ نظر اس پر ڈالی اور مسکرا دی۔ اس عرصے میں ساجد نے چند پھول اس کی طرف بڑھائے۔

"چچا کہہ رہے تھے کہ میں یہ پھول تمہیں دے دوں ــــ لو، انھیں گلدان میں سجا دو۔"

اس نے پھول لے کر سونگھے۔ برا سا منہ بنایا اور پھولوں کو وہیں ایک میز پر پھینک کر بولی۔

"ایسے خاص پھول تو نہیں ہیں۔ ہمارے کالج کی بدرو میں اسی قسم کے ہزاروں پھول ہیں۔"

سرخ سرخ پتّی والے ان زرد رنگ کے پھولوں کی یہ بے قدری دیکھ کر ساجد کو بہت قلق ہوا۔ پھول اس کی زندگی تھے۔ اور کافی دیر تک وہ انھیں میز پر کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہوا دیکھ کر افسردہ ہوتا رہا۔ اس کی نگاہیں ان پھولوں ہی کی طرف تھیں کہ وہ بولی۔

"غالباً آپ کو میری اس حرکت سے رنج پہنچا ہے۔؟" ناہید کی آنکھیں پھر مسکرا رہی تھیں۔

"ضرور پہنچا ہوگا ــ" ساجد کی بجائے محبوب نے جواب دیا۔ "لیکن میرے خیال میں پھولوں کے بجائے ہمیں غنچوں کی فکر کرنی چاہیئے۔ کیوں کرنی چاہیئے یہ میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا۔ لیکن فی الحال آپ میرا ہی ایک شعر سنیئے ــــ عرض کیا ہے۔

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

لہذا آپ کو اس کی فکر نہیں کرنی چاہیئے اور یہ سوچنا چاہیئے کہ۔۔۔۔۔"

"بھائی دنیا کے آٹھویں عجوبے ـــ" نجمی صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔ "خدا کے واسطے کبھی تو خاموش ہو جایا کرو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے حلق میں زبان کے علاوہ اور کوئی شئے ہے ہی نہیں۔"

مجذوب کا منھ اتر گیا اور وہ جواب میں صرف پہلو بدل کر رہ گیا۔ ناہید ابھی تک جواب طلب نظروں سے ساجد کو دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ خاموش تھا۔ برابر کے کمرے میں سے ملازم نے آکر اطلاع دی کہ نجمی صاحب سے کوئی ملنے آیا ہے۔ لہذا نجمی صاحب فوراً اٹھ کر اس طرف چل دیئے اور احتیاطاً مجبوب کو بھی ساتھ لے گئے۔ ساجد نے بھی اٹھنا چاہا کہ ناہید نے فوراً کہا۔

"آپ بیٹھئے نا ـــ"

وہ چابی کے کھلونے کی مانند بیٹھ گیا۔ ناہید بدستور مسکرا کر اسے دیکھتی رہی۔ اور وہ کھڑکی سے باہر دکھائی دینے والے ان سوگوار بادلوں کو دیکھنے لگا جو پہاڑی کی طرف دھیرے دھیرے رینگ رہے تھے۔

"آپ کو پھولوں کی بے عزتی بری لگی ہے شاید!"

وہ خاموش رہا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔

"آپ گونگے کیوں ہو گئے؟" وہ اٹھ کر اس کے قریب آئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"واقعی آپ کو پھولوں کے اس طرح پھینکے جانے کا رنج ہے کیا؟"

خاموشی ـــ اداسی۔

"آپ بولتے کیوں نہیں ؟"

"ہاں — میں اس قدر دل برداشتہ ہوں کہ کسی بھی حسین شئے کا برا انجام نہیں دیکھ سکتا۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے — آپ بہت حسّاس ہیں — ہیں نا۔"

"پتہ نہیں۔"

"اچھا اگر میں ان پھولوں کو اٹھا لاؤں تو کیا انعام دیں گے۔؟"

ساجد نے اُسے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس نے اتنی مضحکہ خیز صورت بنا رکھی تھی کہ ساجد کے لبوں پر ایک گہری مسکراہٹ آکر ٹھہر گئی۔

"صرف یہ — یعنی صرف مسکراہٹ۔" وہ یکایک اچھل کر بولی۔ "بس اتنا سا انعام۔ ! — مگر خیر، کوئی حرج نہیں۔ میرے لئے یہ انعام بہت بڑا ہے —"

ساجد نے حیرت سے اسے دیکھا — وہ خود بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"میں آپ کو مسکراتا ہوا ہی دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"میں تو اب ہنستا ہی رہتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔

"بڑی اچھی بات ہے۔ اداسی دراصل چھوت کی بیماری ہے، ہر ایک کو لگ جاتی ہے۔"

"مگر یہاں تو یہ بیماری کسی کو نہیں لگی، نجمی صاحب ہنستے ہیں، وہ احمق مجذوب ہنستا ہے، میں ہنستا ہوں۔ اب تم آئی ہو تو تم بھی ہنستی رہو گی۔"

"یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں —" اس نے ایک ٹھنڈی سی سانس بھری۔

"کیوں تمہیں کونسا دکھ ہے۔؟" ساجد کو تعجب ہوا۔

"دُکھ اور اداسیاں کہہ کر تو نہیں آیا کرتیں۔ آج میں ہنس رہی ہوں کل رو بھی سکتی ہوں۔" وہ عینک اتار کر اس کے شیشے صاف کرنے لگی۔

"کیسی باتیں کرتی ہو ناہید۔۔ میں تمہیں کبھی رنجیدہ نہ ہونے دونگا۔ دیکھ لینا۔"

"بہتر ہے۔۔ دیکھ لوں گی۔"

چند لمحوں تک وہ خاموش رہی اور اس وقفے میں پھولوں کو میز پر سے اٹھا کر گلدان میں سجاتی رہی۔ کنکھیوں سے بار بار ساجد کو بھی دیکھتی جا رہی تھی۔۔۔ پھولوں کی پنکھڑیوں کو اپنی مرمریں انگلیوں سے چھونے کے بعد بولی۔

"نرم و نازک پھولوں سے مجھے بھی عشق ہے۔ جس طرح سے یہ پھول مسکرا رہے ہیں، میری خواہش ہے کہ آپ بھی یوں ہی مسکراتے رہیں۔۔ آپ کو ہنستے دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ میری محنت کا یہ پہلا صلہ دیا ہے آپ نے۔"

وہ حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

"سچ کہتی ہوں جب سے ابا جی نے آپ کی افسردگی کے بارے میں بتایا ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ پوری کائنات کی خوشیاں اکٹھی کر کے آپ کے قدموں میں چن دوں۔"

"تم شاعری کر رہی ہو کیا؟" ساجد دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔

"یہ شاعری نہیں میرے دل کی آواز ہے۔۔" وہ قطعی سنجیدہ تھی۔

"ہمارا خاندان کتنا مختصر ہے۔! اور افسوس یہ ہے کہ پھر بھی ہمیں ایک دوسرے کی خبر نہیں رہتی۔ حالانکہ اتنے قلیل کنبے کو ایک ہی جگہ رہنا چاہیئے۔"

"کیوں۔۔؟"

"تاکہ ایک دوسرے کے غم میں برابر کے شریک ہوں۔"

"کس زمانے کی بات کر رہی ہو۔" ساجد نے تمسخر اُڑایا۔ "غم کبھی بانٹے نہیں جاتے۔"

"مجھے اگر کوئی اپنے غم دے تو سینے سے لگا لوں۔"

"بہت بڑے دعوے ہیں بھئی۔"

"مجھے اپنی باتوں پر ناز تو نہیں ہے، لیکن آپ کو خوش رکھنے کے لئے کیا میری یہ احمقانہ باتیں کافی نہیں ہیں —" تبسم اس کے لبوں پر کھیلنے لگا۔

"واہ — باتیں تم فلسفیوں کی سی کرتی ہو اور کہتی خود کو احمق ہو!" ساجد نے ہنستے ہوئے کہا۔

نجمی صاحب اب پھر کمرے میں وارد ہو رہے تھے۔ اور مجذوب حسبِ معمول منھ کھولے ہوئے ان کے ساتھ تھا۔ نجمی صاحب تو کرسی پر بیٹھ گئے مگر مجذوب کھڑا ہی رہا۔

"بڑے قہقہے لگ رہے ہیں بھئی — ماشاءاللہ ماشاءاللہ —!" نجمی صاحب بولے۔

"یہ ناہید واقعی بہت دلچسپ باتیں کرتی ہیں۔" ساجد ہنستے ہوئے بولا۔

"اماں محبوب بیٹھو تم کھڑے کیسے رہ گئے۔"

"اچھا —" محبوب ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

"بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے —"

"اس شعر کا بھلا یہ کونسا موقع تھا۔" نجمی صاحب نے ناک چڑھائی۔

"موقع کیوں نہیں ہے۔" ساجد نے وکالت کی ـــــ "ہم چھت کے نیچے بیٹھے ہیں اور یہاں چھاؤں ہی چھاؤں ہے، لہذا گھنی ہے ـــــ اور فی الحال یہ بیچارے غریب الوطن بھی ہیں۔ کیوں محبوب ـــ اور غالباً یہ شعر بھی تمہارا ہی ہے۔"

"اور نہیں تو کیا کسی اور شاعر کا ہے۔" محبوب چہکا۔ "تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں ہمیشہ اپنے ہی اشعار پڑھتا ہوں۔ کیوں پڑھتا ہوں، یہ میں تمہیں پھر کبھی......"

"بھئی بیٹی ـــــ تمہیں یہ پھول پسند آئے؟" نجمی صاحب نے جلدی سے بات کا رخ پلٹا۔

"ہاں ابّا ـــ بہت ہی اچھے ہیں۔"

"یار محبوب، پھولوں پر تم نے کوئی شعر نہیں کہا ـــــ" ساجد جانتا تھا کہ نجمی صاحب محبوب کے اشعار سے بہت جلتے ہیں۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں ـــــ عرض کرتا ہوں...."

"اماں ہٹاؤ بھی، کیا لغویت لے بیٹھے ـــــ" نجمی صاحب نے گھبرا کر کہا۔ پھر کچھ سوچ کر اچانک بولے۔ "مجھے لغویت پر یاد آیا ـــ وہ جو تم آبشار کے نیچے سے نکال کر لائے تھے، وہ اسے بھی تو دکھاؤ نا۔"

"آپ نے خوب یاد دلایا چچا ـــ ابھی لیجیے ـــ" ساجد اٹھتا ہوا بولا۔

"مگر ـــــ مگر وہ کیا چیز ہے؟" محبوب ڈر گیا۔ اس کا خیال تھا کہ مبادا کوئی ایسی چیز ہو جس سے اس کی اور گلبدن کے معاملات پر روشنی پڑتی ہو۔

"شبر ہے ـــ" ساجد نے کمرے کے اندر جاتے ہوئے جواب دیا "تم جلد ہی

اس کی دہاڑ سنو گے۔"

محبوب نے پہلے تو متوحش نظروں سے سب کو باری باری دیکھا اور پھر "مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا" کہہ کر جلدی سے کمرے کے باہر چلا گیا۔ ناہید کے لبوں پر تبسم رقصاں تھا، اپنی حنائی انگلیوں سے وہ گلدان میں لگے ہوئے پھولوں کو درست کر رہی تھی۔

ساجد نے شیشے کے مرتبان میں سے دونوں کیکڑے پکڑ کر ایک ڈبے میں بند کر دیئے۔ پھر اوپر سے ربن باندھ دیا۔ چمکیلے رنگ برنگے گول پتھر اپنے ہاتھ ہی میں رہنے دئے، اور واپس ناہید کے پاس پہنچ گیا۔ پتھروں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی اور پھر ڈبے کو مٹھائی کا ڈبہ سمجھ کر اس نے ربن کھولا۔ ڈھکنا اٹھایا اور پھر جیسے یکایک طوفان آگیا۔ وہ کمرے میں دوڑتی پھر رہی تھی اور ساجد نجمی صاحب کے ساتھ قہقہے لگا رہا تھا۔ اس نے کیکڑوں کی ٹانگیں پکڑ کر انھیں اوپر اٹھایا تو وہ دوڑ کر نجمی صاحب سے لپٹ گئی۔

اس عرصے میں ساجد کیکڑوں کو دوبارہ ڈبے میں بند کر چکا تھا۔ جب ناہید کا سانس درست ہوا تو وہ اس کے پاس آکر بولی۔

"کون سا جانور تھا یہ ——؟"

"کیک وڑا ——" ہنسی کے درمیان ساجد صحیح طور پر نام بھی ادا نہ کر سکا۔

"توبہ —— میری تو جان ہی نکل گئی تھی —— بڑا بدشکل جانور تھا یہ۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"میں اسے خاص طور پر تمہارے لئے آبشار کے نیچے سے نکال کر لایا تھا۔"

چند لمحوں تک وہ خاموشی سے ساجد کو تکتی رہی اور پھر آہستہ سے بولی ——

"اصولاً تو مجھے آپ کے اس مذاق سے ناراض ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن میں ناراض اس لیئے نہیں ہوں کہ آپ نے محض اپنا دل خوش کرنے کے لیئے مجھے بیوقوف بنا کر میرے اچھلنے کودنے کا تماشہ دیکھا — آپ کی مسرت مجھے بہت عزیز ہے! اور اس کے لیئے میں سب کچھ کر سکتی ہوں!"

اتنا کہہ کر وہ تو کمرے کے باہر چلی گئی اور نجمی صاحب ساجد کو اکساتے رہے کہ وہ اسے اور ستائے لیکن ساجد نے مناسب نہیں سمجھا اور ان نازک نازک پھولوں کو دیکھنے لگا جو اب گلدان میں لگے ہوئے شرارت سے مسکرا رہے تھے۔

خوشی کا ایک شدید احساس اپنے دل میں لیئے وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

۱۴

اتنی عجیب و غریب اور کسی حد تک چلبلی لڑکی سے اس کی ملاقات اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بار بار وہ اپنے دل میں سوچتا یہ کیسی لڑکی ہے؟ لہجہ، باتیں اور انداز کتنے عجیب ہیں! اس کے خوبصورت چہرے پر رعب کتنا ہے۔ وقار اور تمکنت کتنی ہے! کیا اب تک وہ اسی کی راہ دیکھ رہا تھا! — سچ، یہ زیبا سے کتنی ملتی جلتی ہے۔!

اس کی بے برگ و گل زندگی میں ناہید کی شکل میں اب بہار آگئی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ ضرور اسے ہنسنا اور مسکرانا سکھا دے گی۔ وہ اب کبھی افسردہ و ملول نہ ہو گا۔ قدرت نے ایک بہن چھین کر دوسری شوخ و چنچل

بہن اسے دے دی تھی۔ کیا یہ اس کے غموں کا مداوا نہیں ہے۔

اس کی نظریں کھڑکی کے شفاف شیشوں میں سے گذرتی ہوئی کاہی رنگ کی نوکیلی پہاڑیوں پر جا کر رک گئیں ۔۔ اور پھر وہاں سے پھسلتی ہوئی جھیل کے سینے پر ڈگمگاتی ہوئی کشتیوں پر پہنچیں۔ اسے محسوس ہوا جیسے ان نظاروں میں اب جان پڑ گئی ہے ۔پہلے یہ سب مناظر کتنے پھیکے پھیکے اور مُردہ تھے۔

یہ معجزہ آخر کس طرح رونما ہوا؟

اس کی نظریں وہی ہیں لیکن مناظر بدل گئے ہیں۔ پھولوں میں دلکشی اور رعنائی آ گئی ہے۔ پتوں پر غضب کا نکھار ہے۔ اور جھیل کے ساکن پانی پر کتنی چمک ہے۔ اب تو خود رو پھول بھی اسے چھپ چھپ کر اور مسکرا کر دیکھ رہے ہیں۔

بات کچھ بھی نہیں تھی، جب دل خوشیوں اور مسرتوں سے بھرپور ہو تو پوری کائنات حسین دکھائی دیتی ہے۔

اس نے سوچا کہ ناہید سے چل کر دریافت کرے کہ کیا وہ آج سینما جانا پسند کرے گی۔؟ اس کے کمرے کے قریب پہنچ کر وہ اچانک ٹھٹھک گیا۔ اندر سے ایک مردانی آواز آ رہی تھی۔

"لیکن میں تو ٹکٹ لے آیا ہوں ۔۔۔" زماں صاحب تھے!

"میرے خیال میں ہمارے درمیان اتنی بے تکلفی تو نہیں ہے زماں صاحب!" ناہید نے جواب دیا۔

"بے تکلفی تو پیدا کی جاتی ہے ناہید صاحبہ! اور میں اس کے لئے کوشاں ہوں۔"

"زبردستی۔!"

"یہ بات نہیں، آپس میں ملتے جلتے رہنے ہی سے بے تکلفی والے تعلقات پرورش پاتے ہیں۔"

"لیکن کیا یہ ضروری ہے؟"

ساجد کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے مزید باتیں سننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ زماں کی زبان میں لکنت پیدا ہو چکی تھی۔ وہ گڑبڑا کر بولا۔

"بے شک ضروری نہیں۔ لیکن ناہید صاحبہ میں اتنا بُرا آدمی تو نہیں ہوں۔"

"میں مانتی ہوں کہ آپ بہت اچھے اور شریف انسان ہیں،" ناہید کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا ــــــ "لیکن دوستی اور تعلقات استوار ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔"

"آپ کو یہاں کوسانی میں آئے ہوئے چار دن تو ہو گئے ہیں۔" زماں نے جز بز ہو کر کہا۔

"کیا چار دن انسان کو پہچاننے کے لئے کافی ہوتے ہیں؟" ناہید نے اُلٹا سوال کیا اور ساجد نے محسوس کر لیا کہ زماں اپنی اس تذلیل پر بری طرح بھنّا گیا ہوگا۔

"میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میری دوستی آپ کے حق میں مفید ثابت ہو گی۔ آپ کو قدم قدم پر یہاں سہارے کی ضرورت پڑے گی۔ بہت ہی ٹیڑھے میڑھے راستے ہیں یہاں کے۔"

"درست ہے لیکن سہارے کے لئے یہاں پہلے ہی سے ابّا اور ساجد صاحب موجود ہیں۔"

"ناہید صاحبہ! خدا کے لئے مجھے غلط مت سمجھئے۔" زماں نے ہر مقام پر شکست کھا کر کہا۔ "میں صرف آپکی دوستی کا خواہاں ہوں مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے۔"

"دیکھئے، میں لاکھ آزاد خیال سہی، مگر پھر بھی ایک مشرقی لڑکی ہوں۔"

"میں جانتا ہوں، مجھے آپ کی یہی بات پسند ہے۔"

"یہ آپ کا اختیاری فعل ہے، لیکن میں سوچوں گی کہ مجھے آپ کی کونسی بات پسند ہے۔"

"دیکھئے، کیا میں آپ کو ٹوٹی ہوئی سڑک سے بچا کر اپنی جیپ میں یہاں تک لے کر نہیں آیا تھا۔؟"

"میں احسانمند ہوں زماں صاحب!" ناہید نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن معاف کیجئے گا، کیا آپ اس احسان کا معاوضہ طلب کرنا چاہ رہے ہیں۔"

"نن نن — نہیں نہیں۔" زماں نے گھبرا کر کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔؟"

"تو پھر آپ کا مقصد کیا ہے؟"

"میں — میں دراصل جو کہنا چاہ رہا ہوں وہ کہہ نہیں پا رہا ہوں۔" غالباً زماں اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔

"خیر کوئی بات نہیں، پھر سوچ سمجھ کر کہہ لیجئے گا۔" ناہید طنز یہ طور پر ہنسی۔

"بہتر، — مگر میں ٹکٹ لے کر جو آیا تھا۔" زماں نے بھیگی بلی کی طرح التجائی لہجے میں کہا۔

"میرے سر میں درد ہے ورنہ ضرور چلتی، آپ خود چلے جایئے، پھر کبھی سہی۔"

ساجد نے اندازہ لگا لیا کہ اب زماں یقیناً باہر آنے والا ہوگا، لہٰذا وہ

بھی جلدی سے کمرے میں داخل ہو گیا اور زماں کو دیکھتے ہی بولا۔

"ارے زماں صاحب، آپ!۔ اطلاع بھی نہیں کی آنے کی؟"

اسکی اچانک آمد پر زماں گھبرا گیا اور پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔"میں ادھر سے گزر رہا تھا سوچا آپ حضرات سے ملتا چلوں، اتفاق سے ناہید صاحبہ مل گئیں۔ بس ان سے باتوں میں الجھ گیا۔"

اس سے پہلے کہ ساجد مزید استفسار کرتا، زماں خود کو سنبھالتا ہوا باہر چلا گیا اور چلتے ہوئے کہہ گیا کہ اسے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ پھر حاضر ہوگا۔

ساجد آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ چند لمحے خاموش رہا اور پھر بولا۔

"کیا بات ہے ناہید، یہ زماں بہت گھبرائے ہوئے تھے۔"

"مجھے لفٹ دی تھی، اب احسان جتانے آئے تھے۔" ناہید نے برا سا منھ بنا کر جواب دیا۔

"مجھے معلوم ہے۔ میں نے سب سُن لیا ہے۔"

"یہ تو اچھی عادت نہیں ہے، دوسروں کی باتیں چھپ کر سننا بری بات ہے۔" ناہید مسکرائی۔

"جانتا ہوں۔ مگر تم دونوں کی باتوں میں لطف آ رہا تھا۔ اندر آ جاتا تو باتیں یک لخت ختم ہو جاتیں۔"

"زماں جیسے لوگوں سے مجھے بہت کوفت ہوتی ہے۔"

ناہید کی بات سن کر کچھ دیر تک وہ خاموش رہا اور سوچنے لگا کہ وہ بھی تو اسے سینما لے جانے کے لئے کہنے آیا ہے۔ اگر اس نے انکار کر دیا تو؟

"ویسے آج پکچر کا پروگرام ہے ـــــ چلوگی۔؟" اس نے پوچھ ہی لیا۔

"چلیے۔ کیا تیار ہو جاؤں ؟" ناہید کھل اٹھی۔

"ہاں بالکل ۔۔ مگر ناہید۔"

"جی۔"

"تم نے زباں سے تو انکار کر دیا تھا۔"

"وہ غیر ہے، اور آپ اپنے ہیں۔" ناہید نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر جواب دیا۔

"ایک بات اور ۔۔۔ تم مجھے ساجد صاحب کیوں کہتی ہو؟"

چند سیکنڈ تک اس نے ساجد کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر بولی۔

"میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میں آپ کو بھائی نہیں کہوں گی ۔۔۔ بس میری مرضی ۔۔۔"

ساجد نے بہت زور کا قہقہہ لگایا اور پھر وہ خود بھی ہنسنے لگی۔

"بس تو تیار ہو جاؤ ۔۔۔ ہم فلم دیکھنے چل رہے ہیں۔"

"مگر آپ کے ساتھ فلم دیکھنے میں کیا لطف آئے گا۔"

"کیوں؟" اس نے حیرت سے دیکھا۔

"آپ ہنسی کے معاملے میں بہت بخیل واقع ہوئے ہیں۔" وہ ہنسی۔

"میں اب تو بخیل نہیں رہا۔ تم نے یہاں آ کر مجھے بہت ہنسنا سکھا دیا ہے۔"

"شکر ہے خدا کا۔ میں دراصل یہی چاہتی ہوں۔" ایک نظر ساجد کو دیکھ کر اس نے نظریں جھکا لیں۔

"اچھا اب چلنے میں کتنا وقت لگے گا۔؟" ساجد نے پوچھا۔

"کچھ تو انتظار کرنا ہی ہوگا۔ لڑکیاں تیار ہونے میں ذرا وقت لیتی ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور وہ بھی قہقہے لگاتا ہوا باہر آ گیا۔

نجمی صاحب اسی طرف آرہے تھے، اسے قہقہہ لگاتے دیکھا تو بغیر سوچے سمجھے خود بھی ہنسنے لگے۔ ساجد نے خود ہی انھیں سب کچھ بتا دیا۔ وہ پھر ہنسے اور بولے۔

"سچ کہتا ہوں بیٹے! مجھے معلوم نہیں تھا اس کی باتوں میں اتنا اثر ہے۔ اب تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اپنی بیٹی کے مقابلے میں، میں ہار گیا ہوں۔ میں نے اتنے عرصے تک تمہیں سیدھی راہ پر لگانے کی کوشش کی مگر سب بیکار۔ اب دیکھتا ہوں تو تمہاری زندگی ہی بدل گئی ہے۔!"

"اس میں کوئی شک نہیں چچا — میں آپ دونوں کا احسانمند ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"پاگل ہو گئے ہو۔ ہم کیا کوئی غیر ہیں؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا بس مسکرا کر رہ گیا۔

"بھئی سچ بات یہ ہے کہ تمہاری بڑی تعریفیں کرتی رہتی ہے۔" نجمی صاحب جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے بولے۔ "مجھ سے کہنے لگی کہ تمہیں پہلے سے کیوں نہیں ملوایا۔ تم اگر ڈورتے تھے تو میں بلا لیتا۔ اب اسے معلوم ہوا ہے کہ اس کے بھی کچھ رشتہ دار ہیں اس دنیا میں۔ کہہ رہی تھی کہ میں انھیں بہت پریشان کروں گی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اب تم کافی خوش و خرم ہو۔؟"

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں۔"

"میں نے کہا تھا نا کہ دنیا میں ہر درد کا علاج موجود ہے۔ لیکن تم اتنے پاگل تھے کہ میری باتوں پر توجہ ہی نہ کرتے تھے — اب میں تم سے ایک بات اور کہہ دوں۔"

"فرمائیے۔" اس نے نجمی صاحب کو کچھ سوچتے پا کر کہا۔

"تم اس کے دل کو کبھی ٹھیس نہ پہنچانا۔ یہ بہت نٹ کھٹ اور ضدی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا دل ٹوٹ جائے۔" نجمی صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس کا کوئی بھائی ہے نہ بہن۔ یہ تم سے ہی ناز نخرے کرے گی۔ تمہیں ہی پریشان کرے گی اور صرف تم سے ہی روٹھے گی۔ تم اسے زیبا کی طرح سمجھنا اور اس کے جذبات کی قدر کرنا۔ سمجھے!"

"یہ ــــ یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں چچا ــــ؟" اس نے تعجب سے کہا۔

"بیٹے، میری یہ باتیں میرے پچپن سالہ تجربات کا نچوڑ ہیں۔ اب تو نہیں لیکن تم آئندہ میرے ان الفاظ کو یاد کرو گے۔ مجھے تمہاری طرف سے خدشہ یوں ہے کہ تم تھوڑے سے قنوطی ہو۔ اور قنوطیت محبت سے متاثر نہیں ہوا کرتی۔"

"مگر چچا ــ میں ۔۔۔۔"

"ناہید کا اس دنیا میں صرف ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔" نجمی صاحب نے بات جاری رکھی۔ "یہ تم کو ہنسائے تو تم بھی اس کو خوش رکھنا۔ اسے کبھی دکھی نہ ہونے دینا ــــ میرا کیا ہے؟ میں تو ایک بگولہ ہوں، جو اس وقت تمہارے سامنے منڈلا رہا ہے۔ خدا جانے کب یہاں سے اٹھ کر فضا میں تحلیل ہو جائے! اسے سنجیدگی سے سوچنا ــــ بھولنا مت۔"

"میں تیار ہو گئی ہوں ــــ" دوسرے کمرے میں سے ناہید کی آواز آئی۔!

"بس اب تم دونوں جاؤ۔" نجمی صاحب اپنی آنکھوں کے گوشوں کو انگلیوں سے پونچھنے لگے۔

"آپ بھی چلئے نا ــ" اس نے اصرار کیا۔

نجمی صاحب ہنسے اور پھر آہستہ سے بولے۔

"جب تمہارا کوئی ہم عمر ساتھی نہیں تھا تو مجبوراً میں بچہ بن کر تمہارے ساتھ ساتھ گھوما کرتا تھا۔ لیکن ناہید کے آجانے کے بعد اب اس فرض سے سبکدوش ہوتا ہوں۔"

نجمی صاحب حسبِ معمول مسکراتے ہوئے چلے گئے اور وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے چچا کے احسانات، ان کی سونے میں تولنے والی باتوں اور ان کی محبت کو یاد کرنے لگا۔ یہ نجمی صاحب کا ہی دم تھا ۔۔۔ ورنہ زمانے کے بے رحم ہاتھوں کے شکنجے سے بچنے کی خاطر وہ آج عمیق ترین جھیل کی آغوش میں ایک ابدی نیند سو رہا ہوتا۔

اس نے سوچا کہ چچا اُسے ناہید کو کبھی دُکھ نہ دینے کے متعلق کہتے ہیں!۔ کاش انھیں احساس ہو جائے کہ اگر اس کے اپنے بس میں ہو تو وہ اپنی گڑیا جیسی بہن کے لئے پوری کائنات کی مسرتیں اکٹھی کر کے اس کے دامن میں بھر دے۔ شب و روز کی دعاؤں کے بعد تو اُسے حیاتِ نو ملی ہے، اب کیا وہ اپنے ہاتھوں ہی سے اس کا گلا گھونٹ دے گا۔؟

ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اپنے کندھے جھٹکائے۔ جیسے ان باتوں کے بوجھ کو اپنے ذہن سے اتار پھینکنا چاہتا ہو اور پھر تیز قدموں کے ساتھ کمرے کی طرف جانے لگا۔

ناہید فیروزی رنگ کی کامدار ساڑھی پہنے آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تھی ـــــ

"تم کب سے کہہ رہی ہو کہ میں تیار ہو گئی ہوں، مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ ابھی کچھ کسر ہے شاید۔"

"بس ابھی ایک منٹ میں۔" ناہید نے بال سنوارتے ہوئے کہا۔
"مصیبت یہ ہے کہ لڑکیوں کو کنگھی چوٹی سے فرصت ہی نہیں ملتی۔"
"ہاں — مجبوری ہے۔"
"اب ختم بھی کر دیہ بناؤ سنگھار۔ کب تک ہوتا رہے گا یہ؟"
"جب تک آپ کھڑے دیکھتے رہیں گے۔" جواب ملا۔
"شاید تم فلم میں نہیں چلنا چاہتیں — میں جا رہا ہوں۔"
"ارے رے — میں چل رہی ہوں۔" اس نے گھبرا کر جلدی سے کہا۔ بال ٹھیک کر کے وہ ساجد کے پاس آ کر کہنے لگی۔ "ساڑھی میں نے بہت عرصہ کے بعد پہنی ہے۔ آپ کو ساڑھی پسند ہے نا۔"
ساجد نے اثبات میں گردن ہلا دی۔
"ہیں — میں اس میں کیسی نظر آتی ہوں۔؟" اس نے بے ساختگی سے پوچھا۔
ساجد نے چونک کر اسے دیکھا۔ ناہید کو فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ یہ اس نے کیا پوچھ لیا۔؟ بارِ حیا سے سرمگیں پلکیں زمیں بوس ہو گئیں اور وہ دانتوں سے نچلا ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔
"کونسی فلم میں چل رہے ہیں؟"
"کوئی سی بھی — جسے تم پسند کرو۔"
"کیوں۔؟" اس نے عجیب انداز سے دیکھا۔
"تمہاری پسند میرے لئے سب سے اہم ہے۔"
"اچھا — لیکن ...."
"چچا نے کہا ہے کہ میں ہمیشہ تمہارا خیال رکھا کروں۔"

ناہید حیرت سے اُسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگی، عجیب نظریں تھیں۔ ایسی نظریں جن میں ہزاروں سوالات مستور تھے۔ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اُداس لہجے میں کہا۔

"اپنا یہ فقرہ یاد رکھیے گا ۔۔ دیکھتی ہوں کہ آپ میرا کتنا خیال رکھیں گے۔"

۱۵

وہ دونوں ہال میں اس وقت پہنچے جب کہ اندھیرا ہو چکا تھا۔ فلم شروع ہو چکی تھی۔ عجیب سی کہانی تھی جس میں سوائے رومانی اور جذباتی مناظر کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ ساجد کو رشتہ داروں کے ساتھ اس قسم کی فلمیں دیکھنے سے بڑی وحشت ہوتی تھی۔ اس بار بھی اس نے پہلو بدلنے شروع کیے۔ شاید وہ ناہید سے باہر چلنے کے لئے کہنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک اسے آگے والی سیٹ پر ایک صاحب برابر بیٹھی ہوئی ایک لڑکی سے چپکے ہوئے نظر آئے۔ ساتھ ہی آواز آئی۔

"تم سمجھتی کیوں نہیں گلبدن ۔ آج کل محبت ایسے ہی ہوتی ہے۔ ہیروئن کو گانا ضرور گانا پڑتا ہے۔ کیوں گانا پڑتا ہے، یہ میں تمہیں پھر کبھی بتلاؤں گا۔"

"مگر مجھے تو شرم آ رہی ہے بابو۔" گلبدن محبوب سے الگ ہوتے ہوئے بولی۔ "اتنے لوگوں کے سامنے یہ دونوں یوں لپٹ رہے ہیں اور بالکل شرم نہیں کر رہے ۔ یہ تو بری بات ہے بابو۔"

"ہئے ہئے، تمہیں یہی تو معلوم نہیں ہے۔" محبوب اور چپک گیا۔ "ہیرو

اپنی پیاری سے شکوہ کر رہا ہے اور وہ جھگڑا کر رہی ہے ــــ مگر ابھی کچھ ہی دیر میں دیکھ لینا کہ یہ دونوں بالکل ہی گلے سے مل جائیں گے۔ کیوں مل جائیں گے یہ تو میں تمہیں پھر بتلاؤں گا لیکن ان کے اس طرح روٹھنے اور من جانے سے مجھے اپنا ہی ایک شعر یاد آگیا۔ عرض کرتا ہوں۔

عاشق و معشوق کا جھگڑا ہی کیا شکوہ ہی کیا
جب گلے سے مل گئے سارا گلہ جاتا رہا۔!"

ناہید بے ساختگی سے ہنس دی اور محبوب نے جلدی سے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

"ارے آپ دونوں۔" وہ جان بوجھ کر چونکا۔

"ہاں۔ کوئی اعتراض ہے؟" ساجد نے تمسخر کے ساتھ کہا۔

"نہیں، نہیں۔ بھلا ایسا کس طرح ہو سکتا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ پھر فلم دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ مگر ساجد نے محسوس کر لیا کہ ذرا ذرا سے وقفے کے بعد وہ پہلو ضرور بدلتا تھا۔ اچانک اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یار ساجد۔ یہاں گرمی بہت ہے۔ میں تو باہر جا رہا ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں ــــ" ساجد نے اُسے زبردستی بٹھاتے ہوئے کہا۔ "موسم سے یہی شکایت اتفاق سے ہمیں بھی ہے۔ کیوں ناہید؟"

ناہید نے مسکرا کر گردن ہلا دی۔

"لہٰذا ہم دونوں بھی باہر جا رہے ہیں۔"

اس کے اتنا کہتے ہی محبوب تو بیٹھ گیا اور ناہید اٹھ کر ساجد کے ساتھ ہو لی۔ ساجد مسکرا رہا تھا۔ باہر آ کر بھی وہ مسکراتا ہی رہا۔ موسم اب کافی خنک

ہوگیا تھا اور پہاڑوں کی چوٹیاں نارنجی غازے میں نہانے لگی تھیں ۔۔ وہ دونوں جھیل کے کنارے آکر کھڑے ہو گئے۔ بادبانی کشتیوں کے بادبان اُتارے جا رہے تھے۔ پہاڑی کوّے اپنی بے ہنگم آوازوں کے ساتھ آشیانوں کی طرف مائل بپرواز تھے۔ شام بیحد قریب تھی۔

"آپ کے دوست کو یہ بھی شوق ہے۔" ناہید نے ہلکی آواز میں پوچھا۔

"ہاں ۔۔ وہ بالکل پاگل ہے۔" ساجد نے قہقہہ لگایا۔

"کیا وہ سچ مچ کا عشق کر رہے ہیں ؟" ناہید نے سنجیدگی سے کہا۔

"ارادے تو اس کے کچھ ایسے ہی ہیں۔"

"لیکن عشقِ صادق تو انسان کو خاک میں ملا دیتا ہے، محبوب صاحب مجھے ایسے دل گردے والے نہیں دِکھائی دیتے۔"

"وقت سے پہلے بھلا کوئی کس طرح یہ بات کہہ سکتا ہے۔" ساجد نے پھر قہقہہ لگایا۔

"ہنستے ہوئے لوگ بھلا عشق صادق سے کیسے آشنا ہو سکتے ہیں۔" ناہید نے دزدیدہ نظر سے اسے دیکھ کر کہا۔" اور محبوب صاحب تو ہر وقت ہنستے ہی رہتے ہیں۔"

"تم نے ایک عجیب فارمولا پیش کیا ہے۔ حالانکہ فارمولے ہمیشہ عمل سے گذر کر ہی فارمولے بنتے ہیں۔"

"میں عملی طور پر اس بات کو ثابت تو نہیں کر سکتی۔ ویسے یقین مجھے کچھ ایسا ہی ہے۔"

"میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ محبوب سنجیدہ ضرور ہے۔" ساجد نے پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا۔ کیونکہ وہ اس موضوع کو جان بوجھ کر نظرانداز

کرنا چاہتا تھا۔

"اگر ایسی بات ہے تو وہ بہت خوش نصیب ہیں۔"

"اسکیٹنگ کرو گی۔؟"

"مجھے اچھل کود پسند نہیں ہے۔"

"تو پھر اب کیا کریں ؟"

"پہلے بوٹنگ کریں گے۔ پھر سامنے والے پہاڑ پر چڑھیں گے۔ پھر جب وہاں چاند نکل آئے گا تو چاند کو دیکھیں گے۔ مجھے چاند کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کا خبط ہے ۔۔ اور پھر پہاڑ کا چاند، جو ہم زمین والوں کو اپنے شہروں سے بس اتنا سا ہی نظر آتا ہے!"

"یہ چاند کو دیکھنے کا خبط تمہیں کب سے سوار ہے۔؟"

"چاند حسین ہے، بے حد حسین ۔ اور میں حُسن کی پرستار ہوں!"

"کہیں کچھ اور بات تو نہیں ہے ناہید!" ساجد نے ہنس کر پوچھا "ایک زمانے میں مجھے بھی یہی عادت تھی۔ اور یہ عادت کن لوگوں میں پیدا ہوتی ہے جانتی ہو۔؟"

"ہاں ۔۔ ناکام عاشقوں میں۔" وہ آہستہ سے ہنسی۔

"تو پھر کیا میں تمہارے بارے میں بھی یہی سوچوں؟"

"آپ کی مرضی ۔۔ لیکن یاد رہے کہ میں فطرت کے ان عطیات کی عاشق ہوں جو پہاڑوں، خوش گلو طیوروں اور گنگناتے ہوئے خنک چشموں کی صورت میں ہر سو پھیلے ہوئے ہیں۔"

"میری عادات سے ملتی جلتی عادتیں ہیں تمہاری۔"

وہ ہنسنے لگی اور پھر اس نے برابر کی کیاری میں سے چند پھول توڑ کر

ساجد کو دیئے۔ اس نے پھولوں کو چند لمحے غور سے دیکھا، سونگھا اور پھر انہیں احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ کشتی کے قریب پہنچ کر آہستہ سے بولا۔

"مجھے تمہاری طرح پھولوں کو پھینکنے کی عادت نہیں ہے۔"

ناہید نے گھبرا کر جلدی سے اسے دیکھا اور پھر اپنے ہونٹ دانتوں میں دبا کر زمین کو گھورنے لگی۔ اس کا چہرہ اس کے جذبات کا آئینہ دار تھا مگر اس نے بڑی خوبی کے ساتھ ان پر قابو پا لیا۔ ایک پھول ساجد کو دیتے ہوئے پھر اس نے کہا۔

"لیجئے اسے میرے بالوں میں لگا دیجئے۔"

"ناہید کو توقع تھی کہ وہ ایسا کرنے میں کچھ جھجک محسوس کرے گا۔ مگر ساجد نے پھول لے کر فوراً اس کے بالوں میں لگا دیا۔ نہ تو اس کے ہاتھ کپکپائے اور نہ جذبات میں ہیجان پیدا ہوا۔ ناہید نے ایک طویل اور ٹھنڈی سانس بھری۔ ساجد خود ہی بوٹنگ کر رہا تھا اور وہ خاموش بیٹھی ہوئی اسے لگاتار دیکھے جا رہی تھی۔ ذہن کچھ اور سوچ رہا تھا اور نگاہیں ساجد پر مرکوز تھیں۔

"کیا بات ہے ناہید۔ تم کیا سوچنے لگیں۔؟"

"کچھ نہیں۔ بس یونہی۔" مختصر سا جواب۔

کشتی دوسری طرف لگی تو وہ دونوں پہاڑ پر جانے والی فراخ پگڈنڈی پر چڑھنے لگے۔ پہلے تو معمولی سی چڑھائی تھی لیکن جلد ہی پگڈنڈی عمودی ہوتے لگی۔ ناہید کوششیں کر کے چڑھنے لگی لیکن جلد ہی سانس پھولنے لگا۔ یہ دیکھ کر ساجد نے جلدی سے اپنا ہاتھ سہارے کے لئے اس کی طرف بڑھا دیا۔ بڑی عجیب نظریں تھیں، جن سے ناہید نے اس وقت ساجد کو دیکھا، شاید

وہ تذبذب میں تھی، یہ سہارا قبول کرے یا نہ کرے۔؟

"ارے کیا سوچ رہی ہو ـــــ ہاتھ پکڑ لو ورنہ تھک جاؤ گی۔"

یہ بات سُن کر وہ چونکی اور پھر جلدی سے اس نے ساجد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نہ جانے ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں کا پرتو تھا یا ہلکے سرخ پھولوں کا عکس۔ ناہید کا چہرہ اچانک شفق میں ڈوب گیا۔ ساجد کا ہاتھ تھام کر وہ وہیں رک گئی۔ سانس کا زیرو بم شدید ہو گیا۔ حسین چہرے پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں اور آنکھیں کسی وحشت زدہ ہرنی کی طرح ساجد کو گھورنے لگیں۔

"کیا ہو۔؟" ساجد خود بھی متعجب تھا۔

اچانک اس نے جلدی سے ساجد کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور لمبے لمبے سانس لینے لگی ـــــ

"کیا بات ہے۔ اوپر نہیں چلنا ہے کیا؟"

"نہیں ٹھیک ہے۔ آپ چلتے رہیے۔" حیا آلود مگر مرتعش لہجے میں اُس نے آہستہ سے جواب دیا۔ ساجد کو حیرت تو ہوئی مگر وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔

پہاڑ کی بلندی پر پہنچ کر اس نے دُور دُور تک نظر دوڑائی۔ گہرے مہیب کھڈوں میں شام جلد ہی ہو گئی تھی۔ اور حدِ نظر پر دکھائی دینے والی برفانی چوٹیاں ناہید کے گالوں کی طرح سرخ ہو گئی تھیں۔ چیڑ کے درختوں نے آپس میں سرگوشیاں بند کر دی تھیں۔ سائے لمبے ہو چکے تھے اور فضا پر ایک درد انگیز سکوت حاوی تھا۔ پھر جلد ہی رات ہو گئی۔ بہت بڑا دودھیا چاند گھاٹیوں کے بطن سے طلوع ہوا۔

ناہید اس چاند کو دیکھ رہی تھی اور اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

"آپ یہاں پہلے آ چکے ہیں۔؟"

"بار ہا۔"

"میرے ساتھ آکر کیسا لگ رہا ہے۔؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔ ہاں آج کا چاند مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ چودھویں کا ہے نا۔"

"کل سے یہ پھر گھٹنا شروع ہو جائے گا۔" وہ اُداس لہجے میں بولی۔

"اسے دیکھ کر جو مسرت ملی ہے وہ عارضی ہے۔"

"مگر ایک ماہ بعد یہ پھر اسی انداز سے طلوع ہوگا۔ مسرتیں فنا کبھی نہیں ہوتیں۔"

"یہ آپ کہہ رہے ہیں جو خود بھی درد و تکلیف کا مزا چکھ چکے ہیں!" اس نے حیرت سے ساجد کو پلٹ کر دیکھا۔

"ہاں — اب میں نے چچا کی کہی ہوئی باتوں پر عمل شروع کر دیا ہے۔ میں نے عہد کیا ہے کہ خواہ مخواہ رنجیدہ اور غمزدہ نہ رہوں گا۔ تمہارے آجانے سے بھی مجھے بڑی مسرت ملی ہے۔"

"میرے دامن میں جو مسرتیں تھیں وہ میں نے آپ کو دیدیں — دیکھئے اب میرے حصے میں کیا آتا ہے۔؟"

اتنا کہنے کے بعد وہ خاموشی سے نیچے اُترنے لگی اور ساجد کو مجبوراً اس کی تقلید کرنی پڑی — دل میں وہ سوچ رہا تھا کہ یہ ناہید بعض دفعہ کتنی بہکی بہکی باتیں کرتی ہے۔!

۱۶

اور پھر یہ چند دن بعد کی بات ہے۔ وہ سب لان میں بیٹھے ہوئے ہلکی اور چمکیلی دھوپ کی گرمی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ نجمی صاحب نے صبح کی ڈاک دیکھ کر ایک خط ناہید کی طرف بڑھا دیا۔

"کس کا خط ہے ابّا۔؟"

"لفافے پر بھیجنے والے نے اپنا پتہ نہیں لکھا۔ خود ہی دیکھ لو۔"

ناہید نے خط لے کر سونگھا اور پھر مسکرائی۔ پہلے اس نے سوچا کہ خط وہیں سب کے سامنے کھول کر پڑھ لے مگر پھر کچھ سوچ کر وہ اندر کمرے میں چلی گئی۔ اور ساجد اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اپنی دانست میں اس نے ناہید کی اداسی کا راز جان لیا تھا۔

"کس کا خط ہو سکتا ہے۔؟" محبوب نے گویا خود سے سوال کیا۔

"تمہیں کیا — تم اپنے کام سے کام رکھو۔" نجمی صاحب نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

"نہیں میں یہ سوچ رہا ہوں کہ انھوں نے خط سونگھا تھا نا — وہ خط یقیناً معطر ہوگا۔ کیوں ہوگا؟ یہ میں آپ کو پھر......"

"ساجد۔ ذرا تم معلوم تو کرو کس کا خط ہے۔" نجمی صاحب نے حسبِ معمول مجذوب کا فقرہ پورا نہ ہونے دیا۔

"آہاہا — کیا بات کہی ہے میں تے۔" محبوب نے نجمی صاحب کی بات کو نظر انداز کر کے آنکھیں بند کر لیں اور ظاہر کیا گویا وہ تصور ہی میں مزا لے رہا ہے۔ "عرض کیا ہے....

پھول کی طرح سے مہکے ہوئے خط آتے ہیں
دیکھ کر جن کو کنول روح کے کھل جاتے ہیں"

ساجد نے آنکھوں کے گوشوں میں سے نجمی صاحب کو دیکھا۔ ناگواری کی شکنیں ان کی پیشانی پر نمودار ہو چکی تھیں اور وہ عینک کے شیشوں میں سے محبوب کو گھور رہے تھے۔ ساجد فوراً اٹھ گیا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس کے کھڑے ہوتے ہی محبوب بھی اٹھ جائے گا اور ہوا بھی ایسا ہی۔ ساجد کو جاتے دیکھ کر محبوب نے خود بھی پر تولے اور نجمی صاحب کی خشمگیں نگاہوں سے بچنے کے لئے ساجد کے ساتھ ہو لیا۔

ناہید آرام کرسی کا سہارا لئے بیٹھی تھی اور اس کے زانو پر خط کھلا ہوا پڑا تھا۔ محبوب، ناہید کی موجودگی میں چونکہ کم بولتا تھا لہٰذا اس نے بہتر یہی سمجھا کہ اندر جانے کے بجائے باغ میں اپنی گلبدن کو تلاش کرے۔ قدموں کی آہٹ سننے کے بعد بھی ناہید نے نظریں اوپر نہیں اٹھائیں۔

"ایسے خطوں کو تنہائی میں ہی پڑھنا چاہیئے۔" ساجد مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔ ناہید خاموش رہی۔

"میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا۔ میں نے آج چور پکڑ لیا ہے۔"

"کیسا اندازہ — کیسا چور — ؟" ناہید نے اداس نظروں سے اُسے دیکھا۔

"تم نے ہمیشہ دل کی بات چھپائی مگر اب یہ معطر خط...."

"اوہ —!" وہ بے دلی سے مسکرائی۔ "آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔"

"میں تو نہیں سمجھا لیکن تم مجھے ضرور غلط سمجھی ہو۔"

"افوہ — اتنی غلط فہمی بھی کیا —" ناہید ہنسی اور پھر یکایک سنجیدہ ہو کر بولی۔ "میری زندگی ایک سنگلاخ اور بنجر زمین ہے، اس میں محبت کے پھول کبھی نہ کھِل سکیں گے۔ ابرِ کرم بھی نہ برسے گا۔ الفت کی خنک ہوائیں بھی بادِ سموم کی مانند چلیں گی۔ آپ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں اس زندگی میں کوئی مرد نہیں آیا ہے۔"

ساجد اس کی سیدھی اور صاف باتوں سے یکایک گڑبڑا گیا اور گھبرا کر بولا۔ "تو پھر یہ خط — ؟"

"تسنیم کا خط ہے۔ اُسے معطر خط بھیجنے کا خبط ہے۔" ناہید نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"سہیلی ہے ؟"

"بہت پیاری اور واحد سہیلی۔"

"تو اس کا معطر خط پا کر اتنی اداس کیوں ہو ؟"

"وہ پرسوں یہاں آرہی ہے۔"

"پھر تو تمہیں خوش ہونا چاہیئے۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ وہ یہاں آکر سب پر بوجھ بنے گی۔؟"

"سب پر نہیں —— صرف مجھ پر ——" ناہید نے ساجد کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں سمجھا نہیں۔" ساجد گھبرا گیا۔

"سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں —— آیئے باہر ابا کے پاس چلیں۔"

"عجیب بات ہے، تم اپنی ایک عزیز سہیلی کی آمد سے اتنی پریشان اور رنجیدہ ہو؟"

"اس میں بہت سی خوبیاں ہیں ساجد صاحب۔" ناہید نے حزن آمیز مسرت کے ساتھ کہا۔ "تسنیم کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے۔ وہ بہترین فنکار ہے، مصوّر ہے، موسیقار ہے۔ بلا کا سُریلا گلا پایا ہے اس نے۔ جس کے سامنے گا دے تو سورِ اسرافیل کی مانند مُردوں کو بھی جگا دے۔ میں نے اُسے لکھ دیا ہے کہ جلد آئے۔ ہماری یک رنگوں میں جان پڑ جائے گی میں نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ایک صاحب گھر میں مقیم ہیں۔ خوفناک انسان ہیں ان سے ڈرو گی نہیں اس شرط پر آؤ۔"

"ارے سچ مچ —— !" اس نے مصنوعی حیرانی سے کہا۔

"اور یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ صاحب ہمارے رشتے دار بھی ہوتے ہیں میرے ابا کے بھائی جان کے صاحبزدے ہیں۔ اور میرے کوئی نہیں ہوتے۔"

"کیا واقعی میں تمہارا کوئی نہیں ہوتا —— !" ساجد نے مسکرا کر پوچھا۔

ناہید نے اسے چونک کر دیکھا ــــ بڑی گہری نظر سے دیکھا۔ چند لمحوں تک اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ اس کے لب کپکپا رہے تھے اور چہرے پر سوگواری لوٹ رہی تھی۔ ایک طویل ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"بہت کچھ ہوتے ہیں۔"

جب وہ کمرے سے نکل کر لان میں آیا تو نجمی صاحب پائپ میں تمباکو بھر رہے تھے۔ اس نے انھیں مختصر طور پر خط کے بارے میں بتایا۔ نجمی صاحب خود بھی کچھ سوچنے لگے اور جب وہ چلنے لگا تو وہ بولے۔

"بات سنو۔" وہ پائپ کو دیا سلائی دکھاتے ہوئے بولے۔ "میں تسنیم کو جانتا ہوں مگر تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم ذرا احتیاط سے کام لینا۔"

"میں سمجھا نہیں۔" ساجد کو بڑی حیرت ہوئی۔

"کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جس پہاڑ پر سے انسان ایک بار پھسل جائے پھر دوبارہ اس پر چڑھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔"

"لیکن اگر بار بار کی کوشش سے وہ کامیاب ہو جائے تب ـــ ؟"

"ٹھیک ہے۔ لیکن اس بار کی کوشش میں جو صبر آزما وقت صرف ہوگا، جو تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں گی۔ انھیں صرف ہمت والے ہی برداشت کر سکتے ہیں۔ جب تم بار بار کی کوشش کے بعد چوٹی پر پہنچ جاؤگے تو بری طرح تھکے ہوئے ہوگے ــــ" نجمی صاحب نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر دیں ــــ "سنو بیٹے، تم اب محبت نہیں کروگے۔ مجھے یقین دلاؤ کہ تم ایسا نہیں کروگے۔"

"چچا ــــ یہ فعل اختیاری تو نہیں ہے ــــ" ساجد ان کی بات سمجھ کر

مسکرایا۔

"حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم بچے نہیں ہو۔ میں تمہیں محبت کرنے سے اس لئے منع کر رہا ہوں کہ وہ صرف رونے کا نام ہے، جدائی کا نام ہے۔ اور جدائی سہنے کی تم میں طاقت نہیں ہے۔ کشود کے جانے کے بعد تمہاری کیا حالت ہوئی یہ تم خود بھی جانتے ہو۔ میں اب تمہیں بسورتا ہوا دیکھنا پسند نہیں کرتا۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں چچا۔"؟ اس نے تعجب سے پوچھا۔

"صرف یہ کہ تسنیم سے الفت کی پینگیں نہ بڑھائی جائیں۔ اس کی قربت کم سے کم حاصل کی جائے اور اسے خوابوں میں بسانے کی خواہش نہ کیجائے۔"

"چچا ــــ!" اس نے انھیں حیرت سے دیکھا۔

"محبت کرنا جرم نہیں مگر جب اس ظالم محبت نے کسی نوجوان کو بارہا فریب دیئے ہوں اور پھر وہ نوجوان جان بوجھ کر اس آگ سے کھیلے اس کو تم کیا کہو گے۔؟"

"میں تو صرف اتنا ہی کہوں گا کہ اس بازی میں ہار جیت تو ہوتی ہی ہے۔ مگر ہارنے والا بھی ایک بار ضرور جیتتا ہے۔ رہی فریب کی بات تو فریب کھانے کی اب تو عادت سی پڑ چکی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کوئی بار بار فریب دے اور میں بارہا فریب کھاؤں۔"

"تم گدھے ہو ــــ" نجمی صاحب نے آہستہ سے کہا۔

"اور یہ گدھا آپ کو یقین دلا دیتا ہے کہ جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی ہو گا۔"

اتنا کہہ کر ساجد بنگلے کے دروازے سے گزرتا ہوا باہر روش پر آگیا اور پھر نشیبی راستے پر ہو لیا۔ وہ بازار میں جانا چاہتا تھا۔ بس یونہی ــــ

نہ جاتا تو گھر میں پڑا رہتا۔ پہلے اس کی یہی حالت تھی مگر ناہید کی آمد نے اتنا تو کام دکھایا تھا کہ اندھیروں میں رہنے والا انسان اب دن کی چکا چوند میں گھومنا پسند کرنے لگا تھا۔ جھیل کے سینے پر بادبانی کشتیاں سبک خرامی سے رواں تھیں اسے یوں لگ رہا تھا کہ جنت کے ایک خوبصورت گوشے میں حوریں محوِ خرام ہیں۔ حالانکہ اب سے پہلے یہی کشتیاں اسے قبرستان میں کفن پوش لاشیں نظر آتی تھیں۔ کتنا بدل گیا تھا وہ ــــ کتنا تغیر ہو گیا تھا اس میں! اور یہ تبدیلی یہ تغیر محض ناہید کی آمد نے پیدا کیا تھا۔ خزائیں اس کے چمنِ دل سے کترا کر نکل گئی تھیں اور اب اس کے گوشے گوشے پر بہاروں کا تسلط تھا۔

جب وہ بازار سے ہو کر واپس بنگلے پر پہنچا تو کتابوں کا ایک بنڈل اس کے ساتھ تھا۔ ناہید نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور پھر سوئیٹر بننے میں مصروف ہو گئی ــــ

"تم نے پوچھا نہیں کہ میں تمہارے لئے کیا لایا ہوں۔؟"

"کوئی اچھی ہی چیز ہو گی۔ کیا ہے؟"

"کتابیں ــــ ڈھیر ساری کتابیں۔"

"مطالعہ مجھے بہت پسند تھا، مگر اب کچھ بھی پسند نہیں ہے۔" اس نے کتابیں دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا ــــ "میری اپنی داستانِ حیات ادھوری ہے، کسی اور کی داستان کیا پڑھوں۔؟ اور پھر یہ کتابیں ــــ یہ تو المیے ہیں معاف کیجئے گا مجھے ایسی کہانیاں پسند نہیں جن کا انجام المیہ ہو۔ جس کی اپنی زندگی میں غم ہی غم ہیں، جس کی طرف مصائب اور الم کے سیاہ بادل بڑھ رہے ہوں، وہ بھلا ایسی ہی کہانیاں کیوں پسند کرے گا۔؟"

"مگر ناہید سوال یہ ہے کہ تمہاری زندگی تو الم اور مصائب سے آشنا

نہیں ہے۔ تم ایسی بات کس طرح کہہ سکتی ہو۔"

"اور آپ سے یہ کس نے کہا کہ مجھ پر غم واندوہ سایہ فگن نہیں ہیں ـــ!"

"اگر ایسا ہے بھی تو کیوں؟"

"ہے کچھ ایسی ہی بات ـــ بتانے کی نہیں ہے۔" وہ بے دلی سے مسکرائی لیکن ساجد غمگین ہو گیا۔ یہ احساس کہ اسے مسرتوں سے ہمکنار کرانے والی لڑکی کے سینے میں بھی غم پل رہے ہیں اُسے فکرمند کر گیا۔ ناہید نے جب اس کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھا تو قہقہہ لگا کر بولی۔

"آپ ناراض کیوں ہو گئے ـــ اچھا اگر میں یہ کہہ دوں کہ مجھے یہ کتابیں پسند ہیں تب؟"

"میں تمہارے لئے اتنے چاؤ سے لایا تھا ـــ تمہارے پسندیدہ مصنفین کی کتابیں ہیں یہ۔"

وہ کتابوں کو سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔

"جس کی قسمت میں جو ہونا ہے اسے وہی چیز ملتی ہے۔ واقعی مجھے المیہ کہانیاں ہی پڑھنی چاہئیں۔ سچ کہتی ہوں مجھے یہ بہت پسند ہیں، بہت ہی پیاری ہیں۔"

وہ ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"آپ کتنے اچھے ہیں ـــ میرا کتنا خیال رکھتے ہیں۔!"

"زیبا کا بھی میں اتنا ہی خیال رکھتا تھا۔ لیکن وہ بھی مجھے اسی طرح پریشان کرتی تھی۔" ساجد کے یہ کہتے ہی اچانک اس کا منہ لٹک گیا۔ اس کے حسین

چہرے پر اداسی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ بڑی عجیب نظروں سے اس نے ساجد کو دیکھا۔ ایک گہری ٹھنڈی سانس بھری اور پھر کتابوں کے صفحات پلٹنے لگی۔ تھوڑی دیر تک کمرے پر ایک بوجھل سکوت حاوی رہا اور آخر اس نے خود ہی اس سکوت کو توڑا۔

"آپ میرے لئے بہت اچھا تحفہ لائے ہیں۔ غموں کا تحفہ۔ ان کتابوں کو پڑھ کر غم ہی تو ملے گا۔ بڑے اداس افسانے ہوں گے ان میں۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ قیافہ شناسی میں کمال رکھتے ہیں اور دوسروں کے دلوں کا حال بھی جان لیا کرتے ہیں۔ ورنہ آپ کو کیسے معلوم ہوتا کہ میری آئندہ زندگی میں صرف غم ہی غم ہوں گے۔"

"ایسی باتیں مت کرو ناہید۔" اس نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔ "غموں کا میرے سامنے ذکر مت کرو۔ میں نے بڑی مشکل سے ان سے پیچھا چھڑایا ہے۔"

"سبھی کو خوشیاں مل جائیں تو غم کس کے حصے میں آئیں گے؟ میرا شمار ان انسانوں میں ہونا ہی چاہیئے جنہیں غم راس آئیں گے۔" وہ مسکرائی۔

"بیکار کی باتیں مت کرو۔ تمہاری ہنستی کھیلتی زندگی میں بھلا غموں کا کیا گذر۔"؟

"میں اپنے لئے نہیں ہنستی۔ دوسروں کے لئے ہنستی ہوں۔ آپ کے لئے ہنستی ہوں۔ میں غموں کی فکر نہیں کرتی، آپ جانتے ہی ہیں کہ زندگی میں یہ دولت ملتی ضرور ہے۔ آپ ان مراحل سے گزر چکے ہیں اور مجھے ابھی گزرنا ہے۔"

"ناہید ـــ دیکھو ناہید ـ" اس نے التجائی لہجے میں کہا۔ "میں ایسی باتیں سننا پسند نہیں کرتا۔ جس گرداب میں سے میں ہاتھ پاؤں مار کر نکلا ہوں تم پھر وہیں دھکیل رہی ہو مجھے ۔"

ناہید نے کتابیں ایک طرف رکھ دیں۔ پھر ایک کتاب اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔

اچانک وہ خوشی سے چیخی۔

"یہاں آئیے ـــ دیکھئے یہ کیا لکھا ہے ؟"

"کیا ہے ۔ ؟" وہ اٹھ کر قریب گیا۔

"آپ کا نام لکھا ہے یہاں ۔"

اس نے غور سے دیکھا تو کتاب کے کسی صفحے پر کہیں لفظ 'بیوقوف' درج تھا۔

"آپ ہی کا نام ہے نا ؟" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"ہاں ـــ" ساجد نے بلند قہقہہ لگایا۔ "یہ میرا ہی نام ہے۔"

۱۷

پہاڑی کوّوں کی آوازیں اور محبوب علی مجذوب کی پھٹے ہوئے بانس جیسی آوازیں کوئی فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں، تھرکتی ہوئی ٹانگوں، ابروؤں کے اشاروں اور جسم کے لچکیلے پن سے اپنی تازہ غزل زماں کو سنا رہا تھا۔ آواز کم نکل رہی تھی اور جسم زیادہ نرت کر رہا تھا

زماں سگِ لیلیٰ کی ناز برداری کی خاطر سب کچھ برداشت کر رہا تھا۔ یہ کڑوے گھونٹ اُسے مجبوراً اپنے حلق سے اتارنے پڑ رہے تھے۔ محبوب کا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا اور منہ پھاڑ کر وہ تقریباً گا رہا تھا۔

ہمیں شعورِ جنوں ہے کہ جس چمن میں رہے
نگاہ بن کے حسینوں کی انجمن میں رہے

زماں کو دل پر جبر کر کے داد بھی دینی پڑ رہی تھی۔ کلام بیشک اچھا تھا مگر آواز کوّے کی تھی۔ اُسے پوری غزل دانت بھینچ کر سننی ہی پڑی۔

تو اے بہارِ گریزاں کسی چمن میں رہے
مرے جنوں کی مہک تیرے پیرہن میں رہے

زماں سر نیچے کئے بیٹھا تھا۔ مجذوب نے یہ سمجھ کر کہ غالباً اشعار کی خاموش تعریف کر رہا ہے۔ اشعار دوبارہ اور سہ بارہ پڑھنے شروع کر دیئے۔

زباں ہماری نہ سمجھا یہاں کوئی مجروح
ہم اجنبی کی طرح اپنے ہی وطن میں رہے

مجذوب نے یہیں تک پڑھا تھا کہ ایک ستون کی آڑ سے ساجد نے فقرہ چست کیا۔

"یہ کون ماتم کناں ہے؟"

"دیار میں اپنے اشعار پڑھ رہا تھا۔ کیوں پڑھ رہا تھا —— یہ میں تمہیں ....."

"ارے زماں صاحب —— آپ کب تشریف لائے؟" ساجد نے دانستہ محبوب کا فقرہ پورا نہ ہونے دیا۔

"ابھی ابھی حاضر ہوا تھا کہ راستے ہی میں روک لیا گیا۔"

"کس نے روکا ــــ؟"

"میں نے تازہ غزل کہی تھی۔ سوچا کہ لاؤ زماں صاحب کو ہی سنادوں۔"
محبوب نے شرمندگی کے ساتھ جواب دیا۔

"مگر یہ تو مجروح کی غزل تھی!" زماں کو اچانک یاد آگیا۔

"مجروح ــــ کون مجروح، جناب میرا تخلص تو مجذوب ہے۔"

"مگر وہ مقطع ــــ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا عرض کروں۔"

"کچھ بھی عرض مت کیجئے ــــ" محبوب جلدی سے بولا۔ "دراصل میں نے آخری شعر میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اپنے وطن کا کوئی مجروح انسان ہماری زبان نہیں سمجھ سکا۔ مجروح کا مطلب ہے شوریدہ سر، دل کا جلا ہوا، یعنی محبوب، عاشق وغیرہ ــــ اب یوں سمجھئے کہ معشوق، عاشق کی زبان ہی نہ سمجھ سکا۔ اسی لئے وہ کہہ رہا ہے کہ میں اپنے وطن میں اجنبی کی مانند ہوں۔ کیوں ہوں، یہ میں آپ کو پھر بتاؤں گا۔"

محبوب اتنا کہہ کر جلدی سے اٹھا اور جھاڑیوں کے پیچھے چمکتی ہوئی اوڑھنی کو دیکھ کر فوراً باغیچے کے اندر داخل ہوگیا۔ زماں حیرت زدہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور ساجد قہقہہ لگانے لگا۔

"بڑی زعفران زار شخصیت ہے بھئی۔" ساجد نے کہا۔

"یہ شخص ہے ہی ایسا یا پھر بنتا ہے۔؟" زماں نے پوچھا۔

"نہیں، اسی قسم کا ہے۔"

زماں کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ کنکھیوں سے وہ ساجد کو دیکھ رہا تھا یوں لگتا تھا گویا وہ کچھ کہنا چاہتا ہو۔ مگر اظہارِ خیال کا کوئی ذریعہ نہ مل رہا ہو۔ ایک دو بار اس نے پہلو بدلا اور پھر آہستہ سے کہا۔

"ساجد — میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کہیئے۔"

"ناہید صاحبہ کو تم کیا سمجھتے ہو؟"

"عجیب سوال ہے۔ میں سمجھا نہیں۔"

"مطلب یہ کہ تمہارا اور ان کا کیا رشتہ ہے؟"

"وہ میری بہن ہے زماں صاحب۔"

اتنا سنتے ہی زماں کے چہرے پر اطمینان کی سرخی دوڑ گئی اور انھوں نے کہا۔ "بس میں اتنا ہی دریافت کرنا چاہتا تھا۔"

"بس — صرف اتنی سی بات۔"

جواب میں شاید زماں کچھ کہتا کہ اچانک نجمی صاحب برابر کے کمرے میں سے برآمد ہوئے اور ساجد سے سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"اماں جلدی اوپر پہنچو۔ اُس نالائق لڑکی نے کچھ دیر پہلے تمہارے کمرے کو کباڑخانہ بنا رکھا تھا۔"

ساجد گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ خطوط ایسے تھے کہ جو کسی طرح ناہید کی نظر میں نہیں آنے چاہیئے تھے۔ وہ زماں کو وہیں چھوڑ کر جلدی سے اوپر کی طرف بھاگا۔ اور پھر کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھٹھک گیا — کیا یہ اُسی کا کمرہ ہے۔ کباڑخانہ تو پہلے تھا مگر اب تو وہ جنت کا ایک حسین گوشہ نظر آتا ہے۔ ایک ایک چیز قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ گلدان میں رنگ برنگے پھول شرما رہے تھے۔ اور فرش پر ایک تنکا تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے ناہید کو تلاش کیا مگر وہ کمرے میں نہیں ملی۔ برآمدے میں جھانکا تو وہ بے حس و حرکت آرام کرسی پر نیم دراز تھی اور اونچی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر نظریں

جمائے کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں اس کی پشت پر پہنچا اور پھر اچانک سامنے آکر اُسے ڈرانے کی کوشش کی۔ ناہید سچ مچ گھبرا گئی اور اس نے اپنے زانو پر رکھی ہوئی ایک کھلی کتاب اٹھاکر فوراً اپنے چہرے پر ڈھک لی اور پھر منہ پھیر کر اپنے نیچے سے رومال سے آنکھوں کے گوشے پونچھنے لگی۔

ساجد کو بڑا تعجب ہوا ـــ کہیں یہ رو تو نہیں رہی ؟ ـــ اس کی گڑیا جیسی بہن کو کیا دکھ ہو سکتا ہے ـــ ؟ وہ دوسری کرسی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کے برفیلے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں دبا کر محبت سے پوچھنے لگا۔

"کیا بات ہے ناہید ـــ ؟"

"کچھ نہیں ـــ" رندھی ہوئی آواز۔!

"مگر یہ آنسو ـــ ؟"

"آنسو ! ـــ کہاں ؟" وہ فوراً ہی مسکرانے لگی اور رومال کے کونے سے اپنی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے بولی۔ "آج کل کم بخت پروانے بہت آجاتے ہیں۔ کوئی آنکھ میں گر گیا ہے شاید۔"

"مگر یہ پروانے دن کو تو نہیں آیا کرتے۔ ؟"

"آپ کو تو وہم ہو گیا ہے۔"

"کہیں اور بات تو نہیں ناہید ـــ وہ معطر خط والی بات ـــ کوئی یاد تو نہیں آ رہا ؟"

"کس کو یاد کروں گی میں ـــ میرا ہے ہی کون ؟" پھیکی ہنسی!

"تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔ میں نے تمہاری پشت سے دیکھا تھا کہ تم کچھ سوچ رہی تھیں۔"

"نہیں، میں تو کتاب پڑھ رہی تھی!"

"کتاب تمہارے زانو پر رکھی تھی ـــــ جھوٹ مت بولو۔" ساجد مسکرایا۔

اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ ساجد کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ چند لمحوں تک چپ چاپ خلاء میں گھورتی رہی اور پھر یاس آلودہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"یہ سامنے والے پہاڑ ہیں نا ـــــ اندر سے بالکل کھوکھلے ہیں۔ بالکل میری زندگی کی طرح۔ ان سرمئی پہاڑوں کے پیچھے کوئی نہیں جانتا کیا ہے ـــــ مسرت کی جنت یا غم و اندوہ کی دوزخ، خزائیں یا بہاریں۔ میری بے برگ و گل حیات بھی ان پہاڑوں کی طرح ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ میری زندگی میں خوشیاں کب آئیں گی۔ مسرت کے چشمے کب پھوٹیں گے۔ میں سوچتی رہتی ہوں کہ اگر ان پہاڑوں کے عقب میں سچ مچ کوئی جنت آباد ہے تو کیا اس حسین دنیا میں کوئی مسافر نہیں آئے گا۔ کوئی قدم نہیں رکھے گا وہاں!"

"مگر ناہید۔" ساجد حیرت زدہ تھا۔

"میں ان پہاڑوں کے پیچھے جھانکتے ہوئے ڈرتی ہوں۔" اس نے ساجد کی بات کاٹ دی۔ "اس مقصد کے لئے پہاڑوں کی بلندی تک جانا پڑے گا۔ دراصل یہ حماقت ہے۔ عقلمند وہی ہے جو اس بلندی کو دیکھتے ہی اوپر تک پہنچنے کا ارادہ ترک کر دے۔"

"واہ وا ـــــ خوب۔" وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ "تم لفظوں میں شاعری خوب کرتی ہو ناہید۔"

"حقیقت بہت تلخ ہوتی ہے۔ اور لوگ تلخی سے گھبرا کر یا تو میری طرح رونا شروع کر دیتے ہیں یا پھر آپ کی طرح دل کھول کر ہنستے ہیں۔" ناہید نے آہستہ سے کہا۔

اُسے سنجیدہ دیکھ کر وہ خود بھی سنجیدہ ہو گیا۔

"لیکن تم ایسی باتیں کیوں سوچتی رہتی ہو۔؟"

"پھر کیسی باتیں سوچوں۔؟" اس نے ایک بھرپور نظر ساجد پر ڈالی۔

"ناہید —!" ساجد نے اسے غور سے دیکھا۔ "کچھ دنوں سے تمہیں معموں میں باتیں کرنی آ گئی ہیں۔ تم مجھے بتاتی کیوں نہیں کہ تمہیں کیا دُکھ ہے۔ تم کیا سوچتی رہتی ہو۔؟"

جواب میں ناہید نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور پھر پہاڑوں کی سبک چوٹیوں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"دراصل میں بھی ایک ایسی ہی پہاڑی کے نیچے کھڑی ہوئی ہوں۔ کھڑی کیا ہوں، یوں سمجھئے کہ اس پر تھوڑی اونچائی تک چڑھ بھی چکی ہوں۔ لیکن اوپر کی فضا مجھے راس آتی نہیں دکھائی دیتی۔ مجھے ایسا لگتا ہے گویا میں چوٹی تک کبھی نہیں پہنچ سکتی۔ مسرت و نشاط کی اس دنیا میں نہیں جھانک سکتی جو چوٹیوں کے دوسری جانب ہے۔ ماحول بڑا بھیانک ہے۔ راستہ بڑا کٹھن ہے۔ ارادے اور قوتیں یہاں سلب ہو رہی ہیں۔ شوق اوپر لے جانے کے درپے ہے اور میں حیران و پریشان کھڑی سوچ رہی ہوں کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔؟"

ساجد ٹکٹکی لگائے اُسے دیکھتا رہا۔ ایک شدید قسم کا ڈر اُسے اپنی نس نس میں سرایت کرتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اچانک سہم گیا اور پھر دھیرے

سے بولا۔

"یہ تمہیں ایکا ایکی کیا ہو جاتا ہے ناہید! میں تمہیں اس طرح غمگین نہیں دیکھ سکتا۔ خدا کے لئے میرے خیالی محلات کو منہدم مت کرو ۔۔۔ میں نہ جانے تم سے کیا کیا آس لگائے بیٹھا ہوں۔ یوں سنجیدہ مت رہا کرو۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے لبوں کی ذرا سی مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر بھی تبسم لا سکتی ہے۔ تمہاری ہنسی مجھے بھی مسرت سے ہمکنار کر سکتی ہے۔ غموں سے میں نے بڑی مشکل سے چھٹکارا حاصل کیا ہے۔ میں اداسی سے بہت گھبراتا ہوں ۔۔۔"

"میں جانتی ہوں اس لئے آپ سے کچھ نہیں کہتی ۔" اُس نے نظریں جھکا لیں۔

"کیا نہیں کہتیں ۔؟"

"جو میں کہنا چاہتی ہوں ۔۔"

"نہ کہو، مگر میں سب جانتا ہوں ۔"

"کیا ۔۔؟" سرمگیں پلکیں حیرت کا بوجھ لے کر اوپر اٹھیں۔

"میں کچھ کچھ سمجھ چکا ہوں ناہید ۔۔ ویسے زماں صاحب بُرے آدمی نہیں ہیں ۔"

"مگر ۔۔ مگر ۔۔"

شاید وہ کچھ کہتی لیکن نیچے ڈھلوان پر سے چند مزدوروں کو اوپر آتے دیکھ کر خاموش ہو گئی ۔ اُن کی کمر پر اسباب لدھا ہوا تھا۔ اُن کے پیچھے ایک لڑکی آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے کی کوششیں کر رہی تھی۔ ناہید نے اُسے دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

"تسنیم آگئی ہے — اب جبکہ یہ آ ہی گئی ہے، میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"ہوں — کہو —" وہ تسنیم کو دیکھ رہا تھا۔

"اس کے زیادہ منہ مت لگئے گا۔ بہت ہی شوخ اور چنچل ہے یہ — خود کو بہت حسین سمجھتی ہے اس لئے مغرور بھی ہے۔ اگر اس نے کبھی آپ پر کوئی آوازہ کسا تو آپ تو غالباً ہنس دیں گے۔ مگر مجھے بہت طیش آئے گا۔"

"میں اس سے بات ہی نہیں کروں گا۔"

"نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ تسنیم کے استقبال کے لئے نیچے اترنے لگی اور وہ خود خاموشی سے اپنے کمرے میں آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سگریٹ کا کثیف دھواں آہستہ آہستہ کمرے کی فضا میں تحلیل ہونے لگا۔ وہ کرسی سے کمر لگائے سوچ رہا تھا کہ ناہید اتنی اداس اور غمزدہ کیوں رہتی ہے۔ کون سا غم ہے جو اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے؟ — اور پھر اس کے ذہن میں اس شبہ نے سر اُبھارا جس کا اظہار وہ باتوں ہی باتوں میں ناہید سے کچھ دیر پہلے کر چکا تھا — زماں صاحب — ہاں ٹھیک ہے، کافی وجیہہ انسان ہیں زماں — پُرکشش شخصیت کے مالک اور نہایت حلیم و بُردبار — مانا کہ ایک بار ماں سے جھڑپ ہو چکی ہے، مگر فوراً ہی انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اور انھوں نے کشور کے سامنے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ وہ اب ان دونوں کے معاملات میں دخل نہیں دیں گے — تو یہ چھپے رستم زماں ہیں جنھوں نے اس کی پیاری بہن کا صبر و قرار لوٹ لیا ہے۔"

اُسے بڑی ہنسی آئی۔ محبت کا مارا دل، کسی بھی محبت زدہ شخصیت کو اتنی سی دیر میں پہچان لیا کرتا ہے — پھر بھلا اسے اتنا وقت کیوں لگا؟

وہ مسکرانے لگا۔ دماغ پر جو بوجھ مسلط تھا وہ دور ہو گیا۔ ذہن کو فرحت پہنچانے کے لئے اپنی انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کی۔ پریشان بالوں کو درست کیا، آئینہ میں خود کو دیکھ کر سنوارا۔ اور پھر سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا کر مڑا ہی تھا کہ دروازے میں آسٹ ہوئی۔ ناہید تھی۔

"آیئے میں آپ کو اس سے ملواؤں۔"

"میں تو پہلے ہی تیار ہو گیا ہوں ـــ دیکھ لو میں نے بال بھی قرینے کے ساتھ سنوار لئے ہیں۔"

"ناحق سنوارے ـــ آپ کے پریشان بال مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

"اچھا ـــ تو پھر ٹھیک ہے۔ آؤ چلیں۔"

وہ خاموشی سے ایک طویل آہ بھر کر اس کے پیچھے پیچھے ہولی۔

۱۸

تسنیم کو دیکھتے ہی وہ مبہوت رہ گیا۔ صندل سی جبیں، چاند کو شرما دینے والی صورت۔ انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے یاقوتی لب۔ گدازجسم اور حیا کے بوجھ تلے دبی ہوئی نہایت مخمور آنکھیں۔ حسن و رعنائی کا ایسا پیکر اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی کشور اسے شدت سے یاد آئی۔ یہی قد و قامت، یہی شرمانے کا انداز اور ایسی ہی گڑیا جیسی حسین مورت!۔ ایسے ہی موقعوں پر وہ عموماً بھٹک جاتا ہے۔ پاسبانِ عقل نے فوراً اُسے آواز دی اور وہ بھٹکنے سے بچ گیا۔

"یہ میرا انٹ کھٹ اور شریر بھتیجا ہے، ساجد ـــ" نجمی صاحب نے تعارف

کرایا۔

"میری سہیلی تسنیم۔" ناہید نے مسکرا کر کہا۔

تسنیم اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ دراصل اس نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ ناہید کا بھائی اتنا قبول صورت اور مردانہ حسن کا نادر نمونہ ہو گا۔ اُس نے اسے دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل کے محلات میں اس نوجوان کا تو عرصے سے انتظار کیا جا رہا ہے۔ اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو گئیں مرتعش ہونٹوں سے نہ جانے اس نے کیا کہا۔ ساجد نے جواب بھی دیا مگر وہ خود نہیں سمجھ سکی کہ اس کی اپنی زبان سے کون سے لفظ ادا ہوئے تھے۔

ناہید دونوں کو کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ پہلے اُسے توقع تھی کہ ساجد ضرور پھسل جائے گا۔ مگر اب تسنیم کی غیر حالت کا اندازہ لگا کر اُسے افسوس ہوا۔ اس کے برعکس ساجد سنجیدہ تھا اور تسنیم سے گفتگو کرتے ہوئے احتیاط سے کام لے رہا تھا۔

چائے کا دور شروع ہوا اور تسنیم دزدیدہ نظر سے بار بار ساجد کو دیکھتی رہی۔ ساجد کو احساس تھا کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے۔ مگر وہ اب کوئی نیا کھیل شروع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کشور سے بے وفائی نہیں کر سکتا۔ یہی الفاظ بار بار اس کے ذہن میں گونجتے رہے اور وہ تسنیم کی نظروں کا مطلب سمجھ کر بھی انجان بنا رہا۔

اچانک قدموں کی آہٹ ہوئی اور محبوب دروازے میں نظر آیا۔ اس نے غالباً تسنیم کو نہیں دیکھا لہذا آتے ہی فرمایا۔

"شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں"

ساجد کی جان میں جان آئی ۔ وہ گھبرا رہا تھا کہ اس موقع پہ جبکہ تسنیم کی نگاہیں اسے پیغام دے رہی ہیں وہ اس پیغام سے کس طرح بچے ــــ محبوب کی آمد نے یہ مسئلہ حل کر دیا۔

"آؤ بھئی محبوب ــــ آپ سے ملو ۔ آپ ہیں مس تسنیم ۔" ساجد نے تعارف کرایا۔

تسنیم کو دیکھتے ہی محبوب کے دیوتا کوچ کر گئے ۔ اتنی پیاری لڑکی اس نے آج تک نہیں دیکھی تھی ۔ وہ اچانک گڑبڑا گیا اور اس کی شوخی کافور ہو گئی۔ خاموشی سے وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا ۔ ناہید نے چائے بنا کر دی تو کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے پیالی پکڑ لی ۔

"کہاں سے آ رہے ہو؟" ساجد نے پوچھا ۔

"ذرا نیچے تک گیا تھا ۔ وہاں کچھ پہاڑی لوگ ایک میلا لگا رہے ہیں ۔ کیوں لگا رہے ہیں ۔ یہ میں تمہیں پھر بتاؤں گا ۔"

"غالباً اس میلے میں وہ آبشار والے صاحب بھی ہوں گے ۔؟"

"ک ـ ک ـ کون سے صاحب؟" محبوب گھبرا گیا ۔

"وہی سینما والے صاحب!"

ساجد کے اتنا کہتے ہی ناہید بھی ہنس دی ۔ اس پر محبوب بغلیں جھانکتے ہوئے بولا ۔

"بس وہ ایسے ہی ہے ۔ وہ لوگ ناچ گانے کا پروگرام بنا رہے ہیں ۔ مجھ سے کہا کہ میں بھی شریک ہو جاؤں ۔ میں نے حامی بھر لی ۔ کیوں بھر لی یہ میں تمہیں ......"

"ہاں ہاں ، وہ تم انھیں بعد میں بتا دینا ــــ" نجمی صاحب نے جھنجلا کر

کہا۔" اب تم براہ کرم اس قصے کو چھوڑ کر کوئی اور بات کرو۔"

"اب جناب کیا کوئی اور بات کروں ــــ آپ تو مجھے بولنے ہی نہیں دیتے ــــ"

"بولنے سے کون روکتا ہے ــــ مگر تم ہمیشہ بے تکا بولتے ہو ــــ" ساجد نے کہا۔

"بہتر ہے ــــ اب میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ کیوں ہو جاتا ہوں۔ یہ میں آپکو..... خیر چھوڑیئے۔" مجذوب اتنا کہہ کر چپ ہو گیا اور پھر ایسا چپ ہوا گویا سانپ نے اسے نہیں، اس نے سانپ کو سونگھ لیا ہو۔

"بھئی ساجد بیٹے۔" نجمی صاحب نے کہا۔ "تمہیں بہت دن ہو گئے کچھ سنائے ہوئے ــــ آج کچھ ہو جائے ــــ موسم بھی بے نظیر ہے۔"

"چچا آپ کو تو معلوم ہی ہے، مجھے گانے وانے کا تو شوق نہیں ہے۔ ہاں البتہ ستار کبھی کبھار ضرور بجا لیتا ہوں۔"

"آپ ــــ آپ ستار بجانا جانتے ہیں "! اجیرت کے ساتھ مترنم آواز تسنیم کی تھی۔

"ہاں اس قسم کا کہ گدھے سن کر داد دیتے ہیں ــــ" نجمی صاحب نے کہا ــــ

"ہاں یہ درست ہے ــــ محبوب نے کئی بار داد دی ہے۔" ساجد کے اتنا کہتے ہی خوب قہقہے لگے۔ محبوب چونکہ کبیدہ خاطر تھا لہٰذا اس ریمارک پر بھی خاموش ہی رہا۔

چائے پینے کے دوران سب خاموش رہے اور تسنیم کسی نہ کسی بہانے سے اس کو دیکھتی رہی۔ ہوائیں درختوں کے پتوں سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ بڑی

دھیمی سی اور فرحت بخش آوازیں آ رہی تھیں۔ اسی عارضی سکوت میں یہ آوازیں تیز ہو گئی تھیں۔ تسنیم کسی نہ کسی طرح ساجد کو مخاطب کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ ناہید کو دیکھ کر محبوب کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ اس طرح گویا وہ ناہید اور نجمی صاحب کے احکام کی پابندی کر رہا تھا۔

محبوب چاہتا تھا کہ تسنیم اس سے بھی بولے، مگر وہ اسے نظر انداز کر رہی تھی۔ آخر ایک ٹھنڈی سانس لے کر محبوب نے کہا۔

"میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں

کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے؟"

"یہ تم نے کس کا شعر پڑھا مجذوب؟" ساجد نے مسکرا کر پوچھا۔

"میرا ہی ہے اور کس کا ہو سکتا ہے؟" اس نے بیزاری سے جواب دیا۔

تسنیم نے اپنی گھنی ابروئیں اٹھا کر اُسے حیرت سے دیکھا۔ اُسے شاید اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کہ غالب کا شعر محبوب صاحب اپنا کہہ کر پڑھ سکتے ہیں۔

"بولو کیا کہنا چاہتے ہو تم۔ تمہارے منہ میں جو زبان ہے، اس کی آواز سنیں۔" ساجد نے کہا۔

"کیا کہوں؟" مجذوب نے ٹھنڈی سانس بھری اور شعر پڑھا۔

"اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ مجذوب

ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے"

"کیا مطلب ہے اس شعر کا۔؟" ناہید نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ پوچھا۔

"کئی مطلب ہو سکتے ہیں ناہید صاحبہ۔" مجذوب نے تشریح کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارے اس بنگلے کے در و دیوار پر سبزہ اور پھول وغیرہ اُگ آئے ہیں۔ ہمارے گھر میں بہار یعنی تسنیم صاحبہ آگئی ہیں لیکن ہم یعنی میں بیاباں ہیں ہوں۔ یعنی افسردہ ہوں ۔۔۔ کیوں افسردہ ہوں، یہ میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا۔"

تسنیم اب سمجھ چکی تھی کہ مجذوب کس قسم کا آدمی ہے۔ وہ اسے دلچسپی سے دیکھنے لگی اور مجذوب اسے اپنی طرف ملتفت پا کر ریشہ خطمی ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ نجمی صاحب مجذوب کی اوٹ پٹانگ باتوں سے ہمیشہ ہی گھبراتے تھے، لہذا اس وقت بھی وہ بور ہو رہے تھے، انھوں نے ساجد سے مکرّر کہا۔

"بھئی تم لاتے کیوں نہیں اپنے ستار کو ۔۔۔ ذرا تھوڑی سی ٹن ٹن ہو جائے۔"

ساجد مسکراتا ہوا اٹھ گیا اور اس کے ساتھ ہی ناہید بھی اٹھی۔ ساجد کے ساتھ ہی وہ اس کے کمرے میں آئی۔ جب وہ ستار کا غلاف علیحدہ کرنے لگا تو بولی۔

"کیسی ہے میری سہیلی؟"

"ہاں۔ اچھی۔ اور شریف لڑکی ہے۔"

"میں پوچھ رہی ہوں، آپ کو کیسی لگی۔؟"

"غنیمت ہے۔"

"کیا آپ نے محسوس کیا کہ وہ آپ کو پسند کرنے لگی ہے؟" دبی ہوئی آواز میں ناہید نے کہا۔

"کرنے دو اس سے میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟"

"آپ تو اُسے پسند نہیں کریں گے؟"

"نہیں ۔۔۔ میں تمہاری سہیلی کو بد نظری کوئی غلط بات سمجھنے کا موقع نہیں

دینا چاہتا۔ وہ میرے لئے محض ایک ملاقاتی ہی رہے گی۔"

اتنا کہہ کر وہ ستار بغل میں دبا کر آگے بڑھا۔ وہ بھی چند قدم چلی۔ مگر پھر رک گئی۔

"آپ ستار بجائیں گے کیا — ؟"

"ہاں — چچا کا حکم جو ہے۔"

"میرا حکم بھی مانیں گے۔ ؟"

"بسر و چشم — کہو۔" وہ ہنسنے لگا۔

"آپ ستار مت بجایئے گا۔" اس نے نظریں نیچی کر کے کہا۔

"کیوں — کیا میں برا بجاتا ہوں۔ ؟"

"یہ بات نہیں۔ آپ اتنا اچھا بجاتے ہیں کہ نہ جانے کیوں میرے آنسو نکل آتے ہیں — "

"تعجب ہے — !"

"آپ تو تاروں کو چھیڑ دیتے ہیں — لیکن فضا میں دیر تک جھنجھناہٹ باقی رہتی ہے۔ نغمے دیر تک فضا میں گونجتے رہتے ہیں۔ پھر یہ نغمے دھیرے دھیرے دم توڑ دیتے ہیں۔ دل کے تار چھیڑ دینے کا بھی یہی انجام ہوتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں — " اس نے ستار وہیں میز پر رکھ دیا۔

"آپ کا یہ ساز، دلوں کے تاروں کو جھنجھوڑ دیتا ہے تو دل کا ساز بھی بج اٹھتا ہے۔ ہر طرف خوشیاں اور مسرتیں رقص فرما نظر آتی ہیں۔ لیکن دل کا ساز چھیڑنے سے جو قیامت بپا ہوتی ہے، آپ کو اس کا علم ہے — ؟"

"تم واقعی عجیب باتیں کرتی ہو ناہید۔"

"ستار کے سُر تو فنا بھی ہو جاتے ہیں لیکن دل کے تار عرصے تک لرزتے

رہتے ہیں اور دل کے تاروں کا لرزنا اچھا نہیں ہوتا۔"

"وہ کچھ سمجھا اور کچھ نہیں سمجھا۔ ناہید کو چند لمحے تک وہ غصے سے دیکھتا رہا اور پھر مسکرا کر اس کے شانے کو پکڑ کر اُسے باہر لے آیا۔ ناہید مسمریزم کے معمول کی طرح ساتھ آ گئی۔

"ارے بھئی لائے نہیں ستار۔؟" نجمی صاحب نے پوچھا۔

"چچا اس کے تار ٹوٹے ہوئے ہیں —" ساجد نے ناہید کو دیکھتے ہوئے جھوٹ بولا۔

"کمال ہے، مجھ سے کہا ہوتا تو میں بجا لیتا —" محبوب نے کہا۔

"تم کیا بجا لیتے — تمہیں تو کوئی ساز بجانا آتا ہی نہیں —" ساجد نے ہنس کر کہا۔

"کیوں نہیں آتا — بہت سے ساز بجانے آتے ہیں —" محبوب چڑ گیا۔"

"مثلاً —"

"میں گراموفون بجا سکتا ہوں — کیوں بجا سکتا ہوں، یہ میں تمہیں ....."

محبوب نے اتنی بے ساختگی سے کہا کہ نجمی صاحب کو اچھو ہوتے ہوتے بچا اور تسنیم ہنسی کے مارے دوہری ہو گئی۔ سب بری طرح ہنسنے لگے۔

"اس میں ہنسی کی کیا بات ہے —" محبوب نے حیرت سے سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا، سمجھا۔ آپ حضرات میری موجودگی سے گھبراتے ہیں اور میرا مذاق اڑاتے ہیں۔"

"نہیں بھئی یہ بات نہیں —" ساجد نے محبوب کو جواب کھڑا ہو گیا تھا

بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں جی — میں اب نہیں بیٹھ سکتا — اپنا ہی ایک شعر پڑھ کر جا رہا ہوں ـــ

تمہاری محفل سے جا رہا ہوں

اٹھو ہمارا سلام لے لو۔"

وہ جانے لگا تو ساجد نے اٹھ کر وعلیکم السلام کہا اور سب پھر قہقہے لگانے لگے۔

۱۹

تسنیم کو ایک علیحدہ کمرہ دیا گیا جو ناہید کے کمرے سے ملحق تھا۔ ساجد کا کمرہ اوپر کی منزل میں تھا اور محبوب دراصل اس کے ساتھ والے کمرے میں تھا۔ اس لحاظ سے ساجد کو سب سے ملاقات کے لئے زیریں منزل میں آنا پڑتا تھا۔ تسنیم اپنے کمرے میں نیم دراز کچھ سوچ رہی تھی اور ادھر ساجد سگریٹ کے مرغولے فضا میں بکھیرتا ہوا خود بھی اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔!

وہ کتنی حسین ہے۔ اس کی آواز اتنی شیریں، اتنی مترنم اور اتنی شریلی ہے گویا کسی کاروان کی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ان گھنٹیوں کی پُرحلاوت لہروں کے ساتھ بہہ جائے۔ اس کے کانوں میں ابھی تک شہنائیاں بج رہی تھیں۔ تسنیم کی نغمہ بار آواز کے اثر سے اس پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسے کشور یاد آ گئی ـــ کشور، جس کی آواز بھی تسنیم جیسی تھی۔ جس کی ہرنی جیسی آنکھیں بھی تسنیم ہی کی طرح بے قراری سے اطراف کا جائزہ

لیا کرتی تھیں۔ حسن و رعنائی کا وہ پیکر ـــ وفا کی وہ مورت کہاں ہے؟ کس جگہ ہے، وہ کیوں اسے بھول گئی!

اس کی آنکھوں سے سیل رواں بہہ نکلا۔ بڑی دیر تک وہ غمزدہ رہا، آنسو بہتے رہے اور وہ انھیں رومال میں جذب کرتا رہا۔ غالباً اسے خود بھی یہ احساس نہیں تھا کہ اس کی آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں۔ اندازہ تو اس وقت ہوا جب کہ پشت سے مخروطی انگلیوں نے آگے آکر اس کے گالوں پر سے آنسو پونچھے۔

"اتنی قیمتی چیز اور یوں بے دردی سے بہائی جا رہی ہے۔" ناہید تھی ـــ

اس نے گھبرا کر اپنے ہاتھوں سے اپنے گال صاف کئے اور سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر بولا۔

"سگریٹ کا دھواں کم بخت آنکھوں میں لگ گیا شاید۔"

"ہاں لوگ اسی طرح دل کی باتیں چھپاتے ہیں۔"

"کونسی باتیں ـــ؟" زبردستی کی مسکراہٹ اس نے اپنے لبوں پر پیدا کر لی۔

"کشور کا خیال آ گیا ہوگا۔"

"کشور ـــ! نہیں ایسی بات نہیں۔"

"تو کیا آپ اسے بھول گئے۔؟"

"یہ بات بھی نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے، آپ نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اب آنسو نہیں بہائیں گے۔"

"ہاں بعض دفعہ انسان اپنے وعدوں کا پابند نہیں رہتا۔ یہ اختیاری نہیں بلکہ اضطراری فعل ہوتا ہے۔"

وہ چند لمحوں تک اسے بغور دیکھتی رہی اور پھر نظریں نیچی کر کے بولی۔

"غلطی میری ہی تھی ۔۔ میں نے آپ کو ستار بجانے سے منع کیا تھا نا۔ موسیقی روح کی خوراک ہوتی ہے۔ اور جب انسان غمزدہ ہو تو موسیقی تریاق کا کام کرتی ہے۔"

"نہیں ایسی بات نہیں ناہید۔ کیونکہ ....." وہ قہقہہ مار کر بولا۔ "کیونکہ بقول تمہارے مجھے ستار بجانا آتا ہی کب ہے۔"

"ہاں یہ تو میں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔" وہ بھی مسکرائی۔

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔"

"ویسے آپ ستار کے علاوہ ایک اور ساز اچھا بجانا جانتے ہیں۔"

"کون سا ۔۔؟" اس نے اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔

"سازِ دل۔" ناہید کے ہونٹ کپکپائے اور اس نے بال درست کرنے کے بہانے اپنا منہ دوسری سمت کر لیا۔

"سازِ دل ۔۔!"

"ہاں ۔۔ دوسروں کے دل کے تاروں پر آپ کی انگلیاں خوب چلتی ہیں۔ آپ تو یہ ساز چھیڑ کر دور چلے جاتے ہیں اور دردانگیز بازگشت دیر تک قائم رہتی ہے۔"

"حسبِ معمول تمہاری فلاسفی میں اب بھی نہیں سمجھا۔" وہ ہنسا۔

"اب یہ ضروری بھی تو نہیں کہ آپ ہر بات سمجھیں ۔۔ اچھا چلئے ابا کے پاس چلیں۔ وہ شاید اپنی شطرنج پھیلا کر بیٹھ گئے ہوں گے اور یہ

تسنیم شطرنج کی خاطر گھر بار تج دینے والوں میں سے ہے۔"

اور اب ایسا ہوا کہ ہر نئی صبح اس کے لئے خوشیوں کا پیغام لانے لگی۔ وقت ایک تیز رو دریا کی مانند آگے ہی آگے بھاگتا گیا۔ دن گزرتے گئے اور شامیں رنگین ہوتی گئیں۔ اس کا دامن انبساط کی کلیوں سے خالی تھا۔ اور اب یہ دامن اتنا بھر گیا تھا کہ اُسے خدا سے تنگ دامنی کا شکوہ کرنا پڑا تھا۔ اس نے خدا سے توبہ کی تھی کیونکہ اس کے خیال میں خدا نے پہلے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا تھا۔۔۔ لیکن اب ع۔۔۔ اب تو اُسے بیٹھے بٹھائے بہاروں سے بھی حسین لڑکی کا قُرب حاصل ہو گیا تھا۔!

اس نے یہ سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ وہ تو دراصل کسی اور ہی مورت کا پجاری ہے۔ کسی اور ہی وفا کی دیوی کا پرستار ہے۔ پھر آخر وہ تسنیم کی طرف کیوں کھنچ رہا ہے۔؟ اس نے تو چچا سے وعدہ کیا تھا۔ اور ناہید کے سامنے عہد کیا تھا۔۔۔ پھر کیا ہوئے وہ وعدے۔ آخر یہ سب کیا ہے۔ کیوں وہ اس قدر بے تاب ہے؟

وہ تو نہیں جانتا تھا مگر اسے جاننے والے جانتے تھے کہ دراصل وہ محبت کا بھوکا ہے۔ محبت جہاں اسے ملتی ہے وہ اپنا دل وہیں لٹا دیتا ہے۔ یہ اس کی کمزوری ہے۔ فطری کمزوری اور اس کے لئے وہ قابل معافی ہے۔ کیونکہ وہ صرف محبت کے سہارے ہی زندہ رہ سکتا ہے۔!

زندگی اُسے بے حد خوبصورت نظر آنے لگی اور اسے یہ یقین ہونے لگا کہ مسرتوں کا وجود عارضی نہیں ہوتا۔ مشکلات سدِّ راہ ضرور بنتی ہیں لیکن مسرتوں کی منزل تک انسان یقیناً پہنچ جاتا ہے۔ کسی نوشگفتہ گلاب کی کلی کو پانے

کے لئے کانٹوں سے ضرور الجھنا پڑتا ہے، کانٹے چبھتے ہیں۔ خون پی لیتے ہیں۔ مگر پھر کلی تک پہنچنے کی اجازت دے ہی دیتے ہیں!

کشور اگر اس سے منہ موڑ کر چلی گئی تھی تو کیا ہوا۔ اس کا نعم البدل تسنیم موجود تھی۔

وہ روز بروز شاداں و فرحاں ہوتا گیا۔ سرسوں کے پھول جیسے گال اب سیب کا رنگ چرانے لگے تھے۔ فراخ پیشانی کو جکڑنے والی لکیریں اب آہستہ آہستہ مٹنے لگی تھیں۔ مضمحل قویٰ میں اچانک توانائی آگئی تھی اور وہی دنیا جو کشور کی بے وفائی کے باعث اُسے بحرِ ظلمات دکھائی دیتی تھی، اب روشن نظر آتی تھی۔ ناہید تو اس کی بہن تھی، بے شک اس نے دلجوئی کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ مگر اس کے پیار میں خواہرانہ محبت مستور تھی اور ساجد کو ضرورت تھی ایسی الفت کی جو اس کی رگوں میں گرم گرم سیسہ پگھلا کر ڈال دے — عورت کی محبت! جس کا وہ ہمیشہ متلاشی رہا، وہ محبت اب اُسے ملنے والی تھی۔!

جب دو جوان دل عرصے تک ایک دوسرے کے سامنے دھڑکتے ہیں تو آنکھوں میں نشیلے ڈورے تیرنے لگتے ہیں اور پلکیں فرطِ حیا سے بوجھل ہو جاتی ہیں۔ وہ تسنیم کے سامنے بیٹھا رہتا اور وہ اپنی بوجھل پلکیں کبھی کبھی اٹھا کر اسے دیکھتی! ساجد خوشی سے جھوم جھوم جاتا۔ کچھ دنوں تک تو اس نے سب کی نظر بچا کر تسنیم کو دیکھنے پر اکتفا کی۔ پھر آہستہ آہستہ باتوں کا آغاز کیا۔ شطرنج نہ جانتے ہوئے بھی اس نے اس کے ساتھ یہ کھیل کھیلا۔ ہمیشہ مات ہوئی اور مات کھا کر وہ خوش ہوتا رہا۔

اس قربت، یکجائی اور شیریں گفتگو کا جو انجام ہونا چاہیئے تھا ہوا۔

اُسے یہ محسوس کر کے بے انتہا خوشی ہوئی کہ وہ پیاری پیاری سی کامنی صورت اس کے من مندر میں گھر کرتی جا رہی ہے۔ محبت نے اُس کے دل پر اتنی آہستگی سے دستک دی تھی کہ اسے محسوس ہی نہ ہو سکا — !

اور پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ تکلف کے بندھن کھُل گئے۔ وہ پھر دن اس سے ہنس ہنس کر بات کرتی اور وہ ہنساتے ہنساتے نہ تھکتا۔ پہاڑ کا کوئی حصہ ایسا نہ رہا تھا جہاں ان کے قہقہے نہ گونجے ہوں۔ ان قہقہوں میں کبھی کبھار ناہید کے مدھم سے قہقہے بھی شامل ہو جاتے تھے۔ مگر جب وہ ہنستی تھی تو یوں لگتا تھا گویا اپنی بے بسی پر قہقہے لگا رہی ہو!

پہلے دن جب ساجد کی ملاقات تسنیم سے ہوئی تھی، تب اُس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اُسے بڑی بے باکی سے دیکھ رہی تھی۔ مگر اب صورت جدا تھی۔ دل میں محبت حلول کر چکی تھی اور بے باکی کی جگہ شرم و حیا نے لے لی تھی۔ اور حیا کے یہ پردے دبیز سے دبیز تر ہوتے جا رہے تھے۔ رات اور دن بس ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیا جا رہا تھا۔

لیکن اس کے برعکس وہ رات بڑی بھیانک تھی جبکہ گہرے سرمئی بادل صبح تک بلک بلک کر روتے رہے — ماحول دھل گیا — درختوں کے پتّے دھل گئے۔ پہاڑوں کی مٹیالی اور مخروطی چوٹیاں دھل گئیں — لیکن نہ دھل سکا تو ناہید کے دل کا میل!

پوری پوری راتیں وہ بستر پر کروٹیں بدلنے میں صرف کر دیتی تھی۔ اور ان راتوں میں بادل بھی گریہ و زاری کر کے اس کا ساتھ دیتے۔ باد و باراں کا شدید طوفان اس کے دل پر جمے ہوئے اس زنگ کو نہیں دھو سکا تھا جو ساجد کی عدم توجہی کے باعث جم گیا تھا۔ اس نے بہتیرے

آنسو بہائے مگر ان مسلسل آنسوؤں کی دھار نے اس کے خرمنِ دل پر تیل کا کام کیا تھا۔ آگ بجھنے کے بجائے اور بڑھتی رہی ــــ دل میں تپن سی محسوس ہونے لگی، آہوں کا دھواں سینے میں گھٹ کر رہ گیا ــــ اور جب اُسے راہِ فرار نہ مل سکی تو اس نے دل کو جلا کر خاک کرنا شروع کر دیا ــــ

دل کے زخم مندمل نہ ہو سکے تو خود دل مجسم زخم بن کر رہ گیا ــ!

۲۰

پر شور بارش نے رات بھر میں خوبصورت پھولوں، ننھی ننھی ڈالیوں اور پورے خطے کو زندگی عطا کر دی تھی۔ لیکن ناہید کی پژمردہ آرزوؤں میں زندگی نہ پڑ سکی۔ اس کی بے برگ و گل حیات کا شجر دیسا ہی سوکھا رہا۔ اس پر مسرت کی نئی کونپلیں نہ کھل سکیں۔ اس کے غم کو کوئی نہیں جان سکا۔ اسی لئے جب وہ صبح بیدار ہوئی تو ذہن پر جمود طاری تھا۔ آنکھیں گلابی اور متورم تھیں۔ خوبصورت چہرے کے خدوخال اب اندرونی کرب کے باعث غم آلودہ تھے۔

نجمی صاحب نے جب اُسے دیکھا تو تڑپ گئے۔

"کیا ہوا بیٹی ــــ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔؟"

"ہاں ذرا ایسے ہی۔" اس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "رات کو غالباً سردی لگ گئی۔"

تسنیم ساجد کے ساتھ بیٹھی ہوئی چائے پی رہی تھی۔ اس کے قدم ان دونوں کی طرف اٹھ گئے۔ تسنیم نے اٹھ کر اس کا ہاتھ تھاما۔گویا اندازہ لگایا کہ اسے بخار تو نہیں ہے؟

"نہیں تو ہلکا سا بخار ہے ناہید۔"

"بخار نہیں وہم ہے۔" وہ ہنسی۔

"تم کل شام سے نظر نہیں آئیں کیا بات ہے؟"

"یہ ضروری تو نہیں کہ میں ہر وقت نظر آؤں۔ اور پھر نظر بھی آؤں تو کس کی خاطر؟" ساجد خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"پہلے میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو۔" اس نے پیار بھری ناراضی سے کہا۔" طبیعت خراب تھی تو مجھے فوراً اطلاع کرنی تھی۔"

"ڈاکٹر بہت سے امراض کا علاج نہیں کر سکتے۔" مترنم ہنسی

"مرض کی صحیح تشخیص ہو جائے تو علاج ہو سکتا ہے۔" ساجد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔" اور میں تمہارا مرض جانتا ہوں۔"

"آپ! —" ناہید کی آنکھیں حیرت کے باعث پھیل گئیں۔" آپ جانتے ہیں۔"

"ہاں۔"

"جھوٹ — آپ بھلا کیا جانیں —" وہ دانتوں میں ہونٹ دبا کر بولی —

"میں جانتا ہوں اچھی طرح جانتا ہوں اور تمہارے اس مرض کا حال آج ہی تسنیم سے کہہ دوں گا۔ فی الحال ڈاکٹر کے پاس چلو — دو منٹ کے اندر تیار ہو جاؤ۔"

ساجد اتنا کہہ کر اوپر کی منزل میں اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ راستے میں وہ سوچتا رہا کہ اب تو زماں کے پاس جانا ہی پڑے گا۔ وہ اس سے اپنی بہن کی زندگی کی بھیک مانگے گا۔ اس کی بے التفاتی نے ہی ناہید کی یہ حالت کی ہے۔ وہ اس سے دریافت کرے گا کہ آخر کیوں وہ ناہید کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیتا — کیوں، آخر کیوں۔؟

لیکن کاش اسے علم ہوتا کہ اس نے کتنی غلط بات سوچی تھی۔!

چند دن بعد جب گہری نیلی جھیل کے شمالی حصے والی پہاڑیوں کے عقب سے تسنیم کے معطر گیسو جیسے بادلوں نے جھانکنا شروع کیا تو ماحول بے حد روح افزا ہو گیا۔ یہ بادل جب لہراتے اور بل کھاتے ہوئے آہستہ آہستہ پہاڑی کو پھلانگتے ہوئے جھیل میں آ آ کر ڈوبنے لگے تو ساجد سے نہ رہا گیا اور اس نے تسنیم سے کہا۔

"آؤ — برفانی چوٹیوں کے دامن میں چلیں — وہاں گلیشیرز کا لطف اٹھائیں گے۔"

"بہت دور جگہ ہے۔ چھوڑیئے۔"

"اچھا وہاں نہیں تو پھر کیمل ٹاپ چلیں — وہی اونٹ کے کوہان جیسی پہاڑی — دیکھو یہاں سے وہ چوٹی بادلوں کی آغوش میں نظر آرہی ہے۔ جب ہم بادلوں میں روپوش ہو جائیں گے تو سچ بڑا مزا آئے گا۔"

"ہاں وہ جگہ نسبتاً قریب ہے۔"

"بس تو تیار ہو جاؤ۔ موسم بہت حسین ہے۔"

"چلیئے — لیکن ناہید کو بھی ساتھ لے لیجیے۔"

"ناہید —!" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"ہاں۔"

"مگر۔!" وہ سوچ رہا تھا کہ آج تو وہ تسنیم سے گھنٹوں باتیں کرے گا۔ ناہید ساتھ ہوئی تو یہ کس طرح ممکن ہوگا۔؟

"مگر کیا۔۔۔؟"

"اس کی طبیعت پچھلے دنوں خراب تھی۔ بادلوں سے بھیگ کر زیادہ خراب نہ ہو جائے۔"

"اب ایسی موم کی بطخ تھوڑی ہی ہے وہ۔" تسنیم نے ہنس کر جواب دیا۔

"کون ہے موم کی بطخ۔؟" ناہید مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر آرہی تھی۔

"تمہارا ذکر ہے ناہید۔" تسنیم نے کہا۔ "ہم اوپر جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ ساجد صاحب کو فکر ہے کہ کہیں تمہاری طبیعت خراب نہ ہو جائے۔"

ناہید نے غور سے ساجد کو دیکھا۔۔۔ گویا اس کی آنکھوں کے ذریعے دل میں اتر کر اندرونی حالات جان لینا چاہتی ہو۔ پھر غالباً وہ سمجھ گئی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر اس نے جواب دیا۔

"ہاں تم جاؤ۔۔۔ ویسے بھی میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

"کیوں نہیں چاہ رہا۔۔۔ اتنا اچھا منظر ہے، ایسے وقت تم گھر میں اکیلی بیٹھی ہوئی کیا اچھی لگو گی۔؟" تسنیم نے اصرار کیا۔

"مجھے یہ منظر اچھے نہیں لگتے، مجھے تنہائی زیادہ پسند ہے۔۔۔" اداس لہجہ۔

ساجد خاموش کھڑا رہا، ناہید کو توقع تھی کہ شاید وہ ایک بار اُس سے کہے مگر ایسا نہ ہوا۔

"آپ اِسے زبردستی لے کر چلیئے ساجد صاحب۔" تسنیم نے کہا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہ اپنی مرضی کی مختار ہیں۔"

"انگریزی کی مثل ہے کہ تیسرا آدمی بھیڑ معلوم ہوتا ہے ــــ آپ دونوں ہر جگہ آجا سکتے ہیں۔ ڈانڈی میں بھی بیٹھ سکتے ہیں۔ اگر میں ساتھ ہوئی تو بوجھ معلوم ہوں گی۔"

"کیا کہہ رہی ہو ناہید ــــ تم اور بوجھ!" تسنیم حیرت زدہ رہ گئی۔

"ہاں، ٹھیک کہہ رہی ہوں۔"

"ناہید ــــ تم بعض دفعہ بہت ضد کرتی ہو۔" ساجد نے خشک لہجے میں کہا۔

ناہید نے اس کے لہجے کی تلخی کو نہ جانے کیسے گوارا کر لیا۔ کچھ دیر تک وہ اسے عجیب سی اداس نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر ایک ٹھنڈا سانس بھر کر بولی۔

"بہتر ہے۔ چلیئے۔"

ناہید کا اتنی جلد رضامند ہو جانا اُسے پہلی بار بُرا لگا۔

اتفاق کی بات تھی، ڈانڈی کوئی نہیں ملی۔ سب سے آگے وہ اور تسنیم اور ان کے پیچھے ناہید۔ اس طرح وہ تینوں پہاڑ کی بلند پیشانی

پر چڑھنے لگے ۔ تسنیم کے سیاہ اور عطر بیز گیسو ہوا میں لہرا رہے تھے اور ساجد کو یوں محسوس ہوتا تھا گویا گھٹائیں اس کے دوش بدوش سفر کر رہی ہیں ۔ کئی بار اس نے ناہید کی نظریں بچا کر ان بالوں کو چھوا۔ جاں [illegible] کی اور روح پرور ٹھنڈک نے اس پر ایک سرور طاری کر دیا ۔ اس سرور انگیز نشے کی بدولت وہ ناہید کی موجودگی کو قطعی بھول گیا ۔ راستے کے مناظر ، خودرو پودے اور لہراتے ہوئے بادل ، جو چیز بھی وہ دکھاتا تو صرف تسنیم کو مخاطب کر کے ہی دکھاتا ۔ پہاڑی ٹنڈرے پکڑ کر وہ اس کے اوپر چھوڑتا ۔ وہ چیختی ، ڈگمگاتی اور پھر سہارے کے لئے وہ اس کے قریب پہنچ کر اپنا سینہ اس کی پشت سے لگا دیتا ۔ ایسے وقت اسے یوں لگتا گویا ایک فرحت انگیز گرمی اس کے جسم میں سرائیت کرتی جا رہی ہے ۔

ناہید گردن نیچی کئے خاموشی سے ان کے ساتھ چلتی رہی ۔ اس کا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا ہوا تھا ۔ اُس کے ملول اور افسردہ چہرے کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا گویا ان حسین مناظر کے سحر نے اس پر ذرا سا بھی اثر نہیں کیا ۔ وہ جان بوجھ کر اُن دونوں کو طرح دیتی رہی ۔ چھوٹے چھوٹے موڑ کچی پگڈنڈی پر حائل ہوتے گئے اور وہ جان بوجھ کر فاصلہ بڑھاتی رہی ۔ تسنیم اور ساجد اس کی نگاہوں سے چھپ گئے ۔ کبھی کبھار اُن دونوں کی ہنسی سنائی دے جاتی تھی ۔ اُسے اب رہ رہ کر قلق ہو رہا تھا کہ آخر وہ کیوں ان دونوں کے ہمراہ آئی ۔ اُس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے لیکن پہاڑ کے نوکیلے پتھروں کا سہارا لے کر وہ برابر اوپر چڑھتی رہی ۔ ساجد نے کہنے کو تو ناہید سے خشک لہجے میں کہہ دیا تھا کہ میں کیا

کہہ سکتا ہوں۔ یہ اپنی مرضی کی مختار ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسے اپنے رویے پر بہت افسوس ہوا تھا۔ ناہید سے جو برادرانہ محبت اُسے تھی بس وہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اُسے بہت تاسف تھا کہ جب کہ اس کی بہن کا دل پہلے ہی ٹوٹا ہوا ہے، اسے اس کا خیال رکھنا چاہیئے تھا۔ اس کی دل بستگی کرنی چاہیئے تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اچانک گھبرا گیا۔

"ارے ناہید کہاں رہ گئی ــــ؟"

"وہ پیچھے پیچھے آ رہی تھی ــ ہم جلد آگے بڑھ آئے ہیں۔" تسنیم نے گھبرا کر جواب دیا۔

"اس کی طبیعت بھی خراب ہے تسنیم ــ تم یہیں ٹھہرو، میں اُسے لے کر آتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر ساجد تیزی سے نیچے اُترا اور چھ سات موڑ گھومنے کے بعد وہ ناہید تک پہنچ گیا۔

"کیا ہوا۔ تم پیچھے کیوں رہ گئیں تھیں ــــ طبیعت تو ٹھیک... ہے نا؟"

ساجد نے اُسے دیکھتے ہی کئی سوال کر ڈالے۔ اُس کے لہجے کی ملائمت اور اس احساس نے کہ ساجد صرف اُسی کی خاطر اُسے سنبھالنے کے لئے نیچے آیا ہے، ناہید کے چہرے پر ایک لمحہ کے لئے تازگی پیدا کر دی۔ اس نے ساجد کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور پھر اس ہاتھ کو بھینچ کر آنکھیں بند کر لیں اور ہانپتی رہی۔

"آؤ ــ میرا سہارا لے کر اوپر چڑھو۔" ساجد نے محبت بھرے

انداز میں ڈانٹا۔
آنکھیں کھول کر سہمی ہوئی نظروں سے اس نے ساجد کو دیکھا اور کہا۔
"چلیئے ـــ مگر سنئے، میں اسی لئے آپ دونوں کے ساتھ نہیں آنا چاہتی تھی ـــ"

"دیکھو ناہید۔ صاف طور سے کہہ دو کہ آخر بات کیا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ شاید تم مجھے اور تسنیم کو ایک ساتھ دیکھنا پسند نہیں کرتیں۔"
"یہ آپ سے کس نے کہا۔؟"
"میرا خیال ہے۔ جو بات پہلے تھی وہ اب تمہارے برتاؤ میں نہیں ہے۔ میں مانتا ہوں کہ وہ تمہاری عزیز سہیلی ہے۔ تم مجھے بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ تمہارا یہ بھائی لاابالی اور کمتر درجے کا نہیں ہے۔ اس کے باوجود تم کہو گی تو میں تسنیم سے دور ہو جاؤں گا۔ میں ہر حال میں تمہاری خوشی کو مقدم سمجھتا ہوں۔"
بڑی صاف باتیں تھیں۔ ناہید بھونچکی رہ گئی۔ بڑی دیر تک خاموش کھڑی ہوئی کچھ سوچتی رہی اور پھر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔
"آپ بالکل بچکانہ باتیں کر رہے ہیں اور سچ یہ ہے کہ میں آپ کو ننھا سا بچہ سمجھتی ہوں۔ آپ ہر کھلونے کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں۔ اور کھلونوں کے پیچھے بھاگنے سے کبھی بچے گر بھی پڑتے ہیں۔"
"مجھے اس قسم کا بچہ مت سمجھو۔ جس کھلونے کو میں نے اس بار حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، وہ انمول ہے۔ اگر تم چاہو تو میں اسے حاصل کر سکتا ہوں۔"
ناہید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا چہرہ بتلاتا تھا کہ ساجد کی بات سن کر اسے ذہنی تکلیف پہنچی ہے۔ اس کا دل بڑے زور سے دھڑکنے لگا۔

رنگ زرد پڑ گیا۔ مگر اس نے خود پر فوراً ہی قابو پا لیا اور مسکرانے لگی ــــ
ساجد کی بات کا جواب دینے کی بجائے وہ آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگی۔

تسنیم نے اب اس کا بازو تھام لیا تھا اور وہ دونوں مسکراتی اور باتیں کرتی ہوئی چوٹی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ چوٹی قریب آچکی تھی۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہے تھے، ناہید ایک نم آلود پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بادل آرہے تھے اور ان کو نہلا کر جا رہے تھے۔ تسنیم کو بادلوں کی کثیف سی بُو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ وہ بار بار منہ کھول کر لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔

ابھی انھیں چوٹی پر آئے ہوئے مشکل سے آدھ گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ کڑک چمک کے ساتھ پہلے تو ننھی ننھی بوندیاں پڑیں اور پھر یکایک موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ تسنیم نے چھپنے کی جگہ تلاش کرنی چاہی مگر سوائے چند درختوں کے وہاں اور کچھ نہیں تھا۔ جس چیڑ کے درخت کے نیچے ناہید بیٹھی ہوئی تھی، تسنیم نے اس کے مقابلے میں دوسرا درخت پسند کیا۔ ساجد اسے لے کر اس درخت کے نیچے پہنچ گیا۔ مگر طوفانی بارش انھیں زیادہ دیر تک محفوظ نہ رکھ سکی اور وہ لگاتار بھیگتے رہے۔

بادلوں کو اس خطرناک انداز سے برستے دیکھ کر ساجد کا دل بیٹھنے لگا۔ اُس وقت وہ تینوں جھیل سے کافی بلندی پر تھے۔ ہوا کے تیز جھکڑ ان کا توازن بگاڑ رہے تھے اور مغربی کونے سے بپھر کر اٹھنے والے بادل طوفان کے مزید شدت اختیار کر لینے کی خبر دے رہے تھے۔

۲۱

بارش میں بھیگنے کے باعث ناہید اور تسنیم کے دوپٹے سینوں سے چپک گئے۔ ناہید بیٹھی ہوئی تھی اس لئے وہ خود کو چھپا رہی تھی لیکن تسنیم کا حسین بدن نمایاں ہو گیا تھا۔ ساجد ٹکٹکی لگائے اُسے دیکھ رہا تھا۔ تسنیم شرما رہی تھی، لجا رہی تھی۔ خود کو ساجد کی بے باک نظروں سے چھپانے کی حتی الامکان کوشش کر رہی تھی، لیکن تندو تیز ہوائیں اس کوشش کو ناکام بنانے پر تلی ہوئی تھیں۔

"ارے — ناہید وہاں اکیلی بیٹھی ہے —" اس نے ساجد کی توجہ ہٹائی۔

"بیٹھا رہنے دو — وہ آرام سے ہے۔" ساجد اس کے اور قریب آگیا۔

"وہ — وہ نجانے کیا سمجھے — میں اس کے پاس جاتی ہوں۔"

"نہیں تسنیم — مت جاؤ، خدارا میرے سامنے ہی رہو۔"

"ابھی آئی —"

اتنا کہہ کر تسنیم درخت کی حدود سے باہر نکل کر بھاگتی ہوئی ناہید کے پاس پہنچ گئی۔ ناہید نے اسے دیکھا اور پھر خود کو سمٹا لیا۔ تسنیم اس سے لگ کر بیٹھ گئی۔ جسم کے بھیگ جانے سے اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ناہید اس کے جسم کا لرزہ محسوس کر رہی تھی۔

"بہت سردی ہو گئی ناہید — کیوں ہے نا؟"

"سردی — نہیں تو —" ناہید نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"تمہیں سردی نہیں لگ رہی —!"

"جس کے دل میں آگ لگ رہی ہو، جس کا پورا جسم پھنک رہا ہو، اُسے سردی کس طرح لگ سکتی ہے۔؟" ناہید نے گویا خود سے کہا۔

"بارش بہت زور پکڑ گئی ہے۔" تسنیم نے کپکپاتے ہوئے بادلوں کی طرف دیکھا۔

"یہ بارش نہیں ہے — یہ تو آسمان سے گرتا ہوا تیل ہے تسنیم — میرے دل میں لگی ہوئی آگ کو یہ اور بھڑکا دیتا ہے۔"

"ناہید —!" تسنیم نے اب اسے حیرت سے دیکھا۔

"ہوں۔"

"یہ تم کیسی باتیں کرنے لگی ہو ناہید۔؟"

"تمہیں پسند نہیں ہیں تو مت سنو۔"

"تم میری عزیز سہیلی ہو اور میں یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتی کہ

تم اس طرح غم زدہ رہا کرو ــــ آخر تمہیں کونسا دکھ ہے ؟"
"مجھے کون سا دکھ ہے !" وہ پھیکی ہنسی کے ساتھ بولی۔
"ہاں ۔"
"دکھوں کا مداوا کوئی نہیں کر سکتا تسنیم ــــ مجھے کوئی دکھ نہیں ہے ۔"
"نہیں کوئی بات تو ضرور ہے ۔"
"تمہارا وہم ہے اور کچھ نہیں ۔"
"مت بتاؤ ۔ لیکن میں پتہ لگا کر رہوں گی ۔"
"کوئی فائدہ نہیں تسنیم ۔ تمہیں تکلیف ہوگی ۔"
"ہونے دو ــــ میں تکلیف آسانی سے برداشت کرنا جانتی ہوں ۔ تیری طرح نہیں کہ دل میں ناسور ہو گیا ہے مگر علاج نہیں کرتی ۔"
"علاج ــــ کیسا علاج ،" وہ حقارت سے مسکرائی ۔ "موت کے علاوہ میرا علاج اور بھی کیا ہو سکتا ہے ؟"
"ناہید ! ـــ تسنیم نے اُسے شانے سے پکڑ لیا ۔ "آئندہ مجھ سے ایسی گفتگو مت کرنا ۔ اور یہ بھی سن لو کان کھول کر کہ میں تمہیں اور تمہارے دکھ کو اچھی طرح جان چکی ہوں ۔ میں تمہیں تمہاری مسرتوں سے ہمکنار کراؤنگی تمہیں جینا سکھاؤں گی ، ہنسنا سکھاؤں گی ــــ سمجھیں !"
"پگلی ، جس کی قسمت میں یہ سب کچھ نہ ہو تو پھر تو کیا کرے گی ـــ کیا اس کی قسمت بدل دے گی ۔ ؟"
"ہاں ناہید میں قسمت بدل دوں گی ـــ میں ساجد صاحب کو تیرے قریب لے کر آؤں گی ۔"

"تسنیم ۔۔" ناہید نے یقین نہ آنے والے لہجے میں چلا کر کہا۔
"چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں ناہید۔ تیری آنکھوں سے میں نے پوری داستان پڑھ لی ہے۔ زباں پر تو کچھ بھی نہ لائے مگر نظریں سب کہہ دیتی ہیں۔"

"تسنیم ۔۔!" اس بار ناہید کی آواز میں درد تھا۔
"مجھے ایک ایک بات معلوم ہے میری بہن ۔۔ میں تجھے اس طرح برباد نہیں ہونے دوں گی۔"
ناہید حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی رہی، محبت نے جس دل پر زخم ڈال دیئے تھے، آج کسی نے اُس پر پھاہے رکھے تھے۔ اُس کے لب کپکپاتے رہے۔ پورا وجود مجسم درد بن گیا۔ بدن میں رعشہ بڑھ گیا۔ آنکھوں نے بھی موسلا دھار بارش کا ساتھ دیا۔ وہ بیتاب ہو کر تسنیم سے لپٹ گئی اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ بڑی دیر تک وہ اِسی طرح تسنیم سے لپٹی رہی۔ آنسوؤں نے دل کے زخم ایک حد تک دھو دیئے اور پھر وہ تسنیم سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔
"میں آج ہی ساجد صاحب سے کہتی ہوں۔" تسنیم نے دلاسا دیا۔
"خبردار تسنیم ۔۔ میں تجھے ایسا نہ کرنے دوں گی۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔
"کیوں ۔۔؟"
"ایک تو مجھے تیرا خیال ہے، دوسرے میں کسی سے محبت کی بھیک نہیں مانگ سکتی۔ اگر مجھے ایسا کرنا ہوتا تو کبھی کا کر چکی ہوتی۔"
"بیوقوف یہ تجھ سے کس نے کہہ دیا کہ میں ساجد صاحب کے خیال کو

دل میں بسائے ہوئے ہوں۔"

"بیشک ایسا نہ بھی ہو — لیکن تسنیم تیرے آجانے سے وہ ان دنوں بہت خوش ہیں۔"

"خدا کے لئے اتنا بڑا فریب مت کھا میری بہن۔" تسنیم نے اس کے ہاتھ کو دباتے ہوئے کہا — "تو مر جائے گی ناہید — سچ کہتی ہوں مر جائے گی۔"

"مرنا کسے نہیں ہے پگلی۔!"

"مگر سسک سسک کر مرنا۔ ناہید میں ہرگز نہیں مانوں گی — میں آج ہی چچا جی اور ساجد صاحب کو سب باتیں بتا دیتی ہوں۔"

"سُن تسنیم۔!" ناہید نے ساجد کو دیکھتے ہوئے کہا جو ان کی طرف آرہا تھا۔ "میں تجھ سے آخری بار کہہ دیتی ہوں کہ میرا راز صرف تجھ تک محدود رہے — میں قسم کھاتی ہوں کہ اگر تو نے اسے آشکار کیا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔"

"ناہید — !" رندھی ہوئی آواز میں تسنیم چیخی۔

"ہاں — میں انھیں غم زدہ نہیں دیکھ سکتی۔ ان کا دل بہت دکھا ہوا ہے۔ میرے دل سے بھی زیادہ — میں پھر تجھے قسم دیتی ہوں — بس خاموش۔"

تسنیم کی نظروں میں بے پناہ ہمدردی نظر آرہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک اُسے گھورتی رہی اور پھر ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگئی۔

"بڑا زبردست طوفان آگیا ہے ناہید —" ساجد نے قریب آتے ہوئے کہا۔ "مصیبت تو یہ ہے کہ یہاں کوئی پناہ گاہ بھی نہیں ہے۔"

"تو کیا اسی طرح نیچے چلیں ۔" ناہید نے زبردستی مسکراتے ہوئے پوچھا۔ دل ہی دل میں وہ بارش کا شکریہ ادا کر رہی تھی کہ گالوں پر پڑی ہوئی بوندوں کے باعث اس کے آنسوؤں کی لڑیاں چھپ گئی تھیں۔ ورنہ ساجد سے ان آنسوؤں کا چھپانا دشوار ہو جاتا۔

"جانا ہی پڑے گا۔" ہوا کی چیخوں میں ساجد کی آواز دب گئی۔

"لیکن راستے میں کچا پہاڑ بھی تو آئے گا۔ سنا ہے کہ ایسے وقت اس کے نیچے سے نہیں گذرنا چاہیئے۔" توجہ ہٹانے کے لئے ناہید ضرورت سے زیادہ بولنے لگی تھی۔

"لیکن یہاں درختوں میں ہم کب تک چھپے رہیں گے۔؟"

ناہید تسنیم کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اور پھر وہ تینوں مرے مرے قدم اٹھاتے ہوئے اس پگڈنڈی کی سمت ہو لئے جو نیچے جا رہی تھی۔ بارش اب کم ہو گئی تھی مگر ہوا کا زور بڑھ گیا تھا۔ چیڑ کے درختوں میں ہوائیں، مہیب آوازیں نکالتے ہوئے پناہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ فضا میں خوفناک سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ ناہید ہواؤں کی شدت سے بے پرواہ، گردن جھکائے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ اس نے دوپٹے کو دوہرا کر کے سینے پر ڈال لیا تھا۔

نیچے اترتے وقت اتفاق سے انہیں ایک خالی ڈانڈی نظر آ گئی۔ مزدور بارش سے بچنے کی خاطر ایک چٹان کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ ساجد کے کہنے پر وہ نیچے چلنے پر راضی ہو گئے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ دونوں میں سے کس کو ڈانڈی میں بٹھاتا۔؟

"اب بتاؤ ناہید کیا کریں۔؟" ساجد نے اس انداز سے کہا گویا یہ

سب کچھ ناہید کی موجودگی سے ہوا ہے۔

"تسنیم بیٹھ جائے گی ۔۔ آپ ڈانڈی کے ساتھ چلے جائیں ، میں آجاؤں گی ۔"

"نہیں نہیں ۔۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ، ناہید تم بیٹھو گی ڈانڈی میں۔" تسنیم نے جلدی سے کہا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا تم جاؤ تسنیم ۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو ناہید۔!" ساجد نے برا مان جانے والے لہجے میں کہا۔ "یہ سب باتیں تو یہاں آنے سے پہلے سوچنا چاہیئے تھیں۔ تمہاری طبیعت خراب تھی مگر پھر بھی تم آگئیں ۔۔ اب مجھے سب سے زیادہ تمہاری فکر ہے ۔"

ناہید خاموش کھڑی رہی۔ اس نے اب تک ضبط کیا تھا مگر ساجد کے لہجے کی تلخی اس نے محسوس کر لی۔ اس طنز نے اس کے ننھے سے دل پر آری کا کام کیا۔ پھول جیسے رخساروں پر یک لخت زردی چھا گئی۔ تھرّائی ہوئی آواز میں وہ قدرے چیخ کر بولی۔

"میں جو آپ سے کہہ رہی ہوں کہ مجھے چھوڑ جائیں ۔۔ میری طبیعت خراب تھی تو کیوں آپ مجھے لے کر آئے ۔۔ چھوڑ جائیے مجھے ۔۔ دھکّا دیدیجئے اپنے ہاتھوں سے اس کھڈ میں ۔"

اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ کر وہ رونے لگی۔ پہاڑی مزدور حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ تسنیم نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے کنکھیوں سے ساجد کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل کا خون ہو رہا تھا۔ اپنی عزیز سہیلی کے درد کو جانتے ہوئے بھی وہ درماں نہیں کر سکتی تھی ۔!

"ساجد صاحب۔ ٹھیک تو ہے آپ ایسے ہی کہے چلے جا رہے ہیں۔" تسنیم نے آہستہ سے کہا ۔۔۔ "وہ اپنی مرضی سے نہیں آئی، میں اُسے لے کر آئی ہوں۔"

"مگر۔۔ مگر میرا مطلب یہ نہیں تھا تسنیم۔" ساجد چوروں کی طرح بغلیں جھانکنے لگا۔

"خیر اس بات کا فیصلہ صرف اسی طرح ہوسکتا ہے۔" تسنیم نے ڈھلوان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا ۔۔۔ "کہ آپ ناہید کو ڈانڈی میں بٹھا کر لائیں۔ میں نیچے چلتی ہوں۔ براہِ کرم مجھے بلانے کی کوشش نہ کریں۔"

ساجد سے پہلے ناہید نے اُسے روکنا چاہا۔ وہ اسے پکارتی رہ گئی مگر تسنیم نے ایک نہ سُنی۔ اور وہ جلد ہی ایک موڑ کے عقب میں روپوش ہوگئی۔ اپنے رویے پر اب ساجد کو افسوس ہو رہا تھا۔ اُسے احساس تھا کہ اس نے ناہید کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

طوفان کم ہوگیا تھا ۔۔ ہوائیں درختوں میں چیختے چیختے تھک گئی تھیں لیکن اُسے یوں لگ رہا تھا گویا کوئی مہیب طوفان تیزی سے اسکی طرف بڑھ رہا ہے۔

۲۲

اُس کی مسرور زندگی میں پھر ایک اُداس شام آئی۔ وہ اپنے کمرے

میں بیٹھا ہوا ناہید کے بارے میں بہت دیر تک سوچتا رہا — درحقیقت وہ بہت غم زدہ ہے۔ ہنسنا ہنسانا تو وہ بالکل ہی بھول گئی ہے۔ اُسے اچانک یہ کیا ہو جاتا ہے؟ پھر اسے خیال آیا کہ اُسے زماں کے پاس چل کر ناہید کے سلسلے میں کچھ کرنا چاہیئے۔ اس نے پہلے اندازہ لگایا تھا کہ زماں خود بھی ناہید کو چاہتا ہے مگر اظہار کرتے ہوئے جھجکتا ہے اور تقریباً یہی حالت ناہید کی بھی ہے۔ وہ زماں کو چاہتی تو ہے مگر اس کی ہمّت افزائی کر کے نسوانی شرم و حیا کی دھجیاں نہیں بکھیرنا چاہتی، ہو سکتا ہے کہ کچھ دن پہلے اُن دونوں میں کھٹ پٹ ہو گئی ہو! ممکن ہے کہ ناہید کی شوریدہ سری اس معمولی سی نوک جھونک کی رہینِ منت رہی ہو!

اُس نے پکّا ارادہ کر لیا کہ وہ زماں کے پاس جائے گا۔ ناہید سے بھی بات کرے گا۔ اور پھر ان دونوں کو ایک رشتے میں باندھنے کی کوشش کرے گا۔

وہ نیم وا آنکھیں کسی فرضی نکتے پر مرکوز کئے ہوئے سوچتا رہا اور سگرٹ کے کش لگاتا رہا۔ اچانک نجمی صاحب کی آمد نے اس کی بے خودی کو توڑا۔ اُن کے چہرے پر آج بلا کا کرب تھا۔

"ساجد بیٹے۔!" انھوں نے آتے ہی کہا۔ "آج میں نے ایک عجیب بات دیکھی ہے۔"

"کیا چچا۔؟"

"اِسے، ناہید کو کیا ہوا — کیا کسی نے اُسے کچھ کہا ہے۔؟"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"بھئی اب تمہیں کیا بتلاؤں — آج پہلی بار میں نے اپنی بھولی سی بچی

کو رد تے دیکھا ہے۔"

ساجد نے گھبرا کر نظریں نیچی کر لیں۔

"اُسے کون سا دُکھ ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"میری ایک بات پر وہ ناراض ہو گئی ہے۔"

"نہیں بھئی ـــــ لڑنا جھگڑنا تو تمہارا روز کا کام ہے ـــــ وہ اس وقت بری طرح رو رہی ہے۔ کوئی اور ہی بات ہے ـــــ" نجمی صاحب سوچنے لگے۔

"وہ بات بھی میں جانتا ہوں ـــــ ایک اور ہی غم اُسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔"

"غم ـــــ!" نجمی صاحب چونکے۔

"جی ہاں ـــــ گستاخی معاف کیجئے گا۔ وہ کسی کو دل ہی دل میں پوجتی ہے۔ لیکن غالباً اُس نے اب اُس پر توجہ دینی کم کر دی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو ساجد۔؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں ـــــ"

"مگر وہ شخص ہے کون؟" نجمی صاحب گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ تم نے مجھے آج تک بتایا ہی نہیں۔ ذرا اُس سے معلوم کرنا۔"

"معلوم کر لوں گا۔ ویسے میں ابھی جا کر اُسے ہنساتا ہوں۔ جو تکلیف میں نے اُسے پہنچائی ہے، اُس کی معافی بھی مانگ لوں گا۔"

"معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے ـــــ وہ تم سے چھوٹی ہے۔" نجمی صاحب نے جلدی سے کہا۔ "ویسے اگر اُسے کوئی غم ہے تو مجھ سے زیادہ تم ہی بہتر طور پر اُسے دور کر سکتے ہو۔ وہ شخص اگر نیار ہے تو مجھے بھی کوئی انکار نہیں ہوگا بس میں تو یہ چاہتا ہوں کہ وہ خوش رہے۔ ہنستی رہے۔ اس کے سوا میں کچھ

نہیں چاہتا۔"

نجمی صاحب کی آواز بھرّا گئی اور وہ جلدی سے کمرے کے باہر چلے گئے۔

اس کے دل کو گویا کسی نے نوکیلے ناخنوں سے کھرچنا شروع کر دیا۔ نجمی صاحب کی آنکھوں میں آج اس نے پہلی بار آنسو دیکھے تھے۔ وہ تڑپ کر اٹھا اور سیدھا ناہید کے کمرے کی طرف بھاگا۔ کمرے کے کواڑ آہستہ سے کھول کر اس نے دیکھا کہ وہ میز پر سر ٹکائے رو رہی ہے۔ وہ دھیرے دھیرے اس کے قریب پہنچا اور آہستہ سے بولا۔

"مجھے معاف کر دو ناہید۔"

وہ یک لخت پلٹی اور حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔ گالوں پر گوہرِ آبدار لرزر ہے تھے۔

"میں نے تمہیں بہت دُکھ پہنچایا ہے۔"

"آپ نے ــــ آپ نے کہاں دُکھ پہنچایا ہے!" اس نے جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھے۔ "یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟"

"نہیں ناہید ــــ مجھے شدت سے احساس ہوا ہے کہ پہاڑی پر میں نے تمہیں کافی بُرا بھلا کہہ دیا تھا۔"

"آپ بڑے ہیں آپ کو اس کا حق پہنچتا ہے۔" وہ مسکرائی اور پھر کھڑی ہو گئی۔

"نہیں یہ بات نہیں۔ اصل میں اب میں تمہارے دل کے راز کو جان گیا ہوں۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ ــــ یعنی آپ....."

ناہید سے فقرہ مکمل نہ ہو سکا اور گھبرا کر اس نے کرسی کا سہارا لے لیا۔

"میں آج ہی تمہارے لئے زماں صاحب کے پاس جاؤں گا۔ اُن سے تمہاری خوشیوں کی بھیک مانگوں گا۔ میں آخر تمہارا بھائی ہوں اور کوئی بھائی اپنی بہن کو اس طرح افسردہ اور پریشان نہیں دیکھ سکتا۔"

"آپ ـــ آپ!" ناہید نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر پھر بڑبڑا کر چپ ہوگئی۔ اس کے دل میں طوفان اٹھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھر بھر آ رہی تھیں۔ بڑی بے کسی کے ساتھ وہ ساجد کو دیکھ رہی تھی۔ اس انداز میں محرومیاں اور ناکامیاں پوشیدہ تھیں۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اسے یوں لگا گویا جسم کا تمام خون کسی نے اچانک نچوڑ لیا ہو۔ جسم میں شدید کمزوری محسوس ہوئی اور وہ بے ساختگی سے پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں عرصے سے تمہاری حالت کو دیکھ رہا ہوں۔ تمہیں چاہیئے تھا کہ مجھے پہلے سے سب کچھ بتا دیتیں ـــ" ساجد نے مسکرا کر کہا۔

اور وہ سوچنے لگی کہ ہائے انھیں کیسے بتائے۔ اُسے قتل کرنے کے بعد قاتل خود پوچھ رہا ہے کہ تجھے قتل کس نے کیا ہے۔؟ کس قدر نادانی ہے یہ۔ کیا یہ کبھی کسی کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھیں گے؟ اس کی حالت غیر ہونے لگی مگر پھر اس نے فوراً خود پر قابو حاصل کر لیا۔ انگلیوں سے پریشان بالوں کو ٹھیک کیا اور پھر اُٹھ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہ اپنے سراپا کا جائزہ لے رہی تھی۔ کیا کچھ نہیں ہے اس میں ـــ جوانی، الھڑ پن، حسن ـــ! پھر یہ ساجد آخر کیوں نہیں سوچتے۔ جو وہ خود کو کہلوانا چاہتی ہے۔ آخر کیوں وہ اس سے اس انداز میں مخاطب نہیں ہوتے۔ وہ خاموش کھڑی ہوئی کچھ سوچتی رہی اور جب وہ پلٹی تو رونی بسورتی ناہید نہیں تھی بلکہ پہلے ہی کی طرح مسکرا رہی تھی۔ خاموشی سے وہ آگے بڑھی۔ ساجد کے کوٹ پر

پڑی ہوئی مٹی کو چٹکی مار کر اُڑا دیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"میں تو اس خاک کی مانند ہوں۔ جس کے دامن پر لگ گئی وہ فوراً اُسے جھاڑ دیتا ہے۔ زماں صاحب بھی میرے ساتھ یہی سلوک کریں گے ـــــ جو آپ سمجھ رہے ہیں وہ بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟" ساجد نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"نہ میں زماں صاحب کو چاہتی ہوں نہ کسی اور کو۔"

"تو پھر یہ آنسو ـــــ یہ رونا دھونا۔"

"ہنسی بھی تو ایک مرض ہے۔ زیادہ ہنسنے کے بعد رونا ضرور پڑتا ہے۔ میں نے اپنے مرض کا علاج کیا تھا کچھ دن تک۔ بہرحال اب آپ مجھے ہنستے ہوئے ہی دیکھیں گے۔"

"مگر ناہید ـــــ دیکھو میں باتوں سے بہلنے والا نہیں ہوں ـــــ میں جانتا ہوں کہ تم اور زماں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو ـــــ میں چاہتا ہوں . . . . ."

"واہ ـــــ خوب کہی آپ نے ـــــ" وہ ساجد کی بات کاٹ کر قہقہہ لگا کر بولی۔ "یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں زماں کو پسند کرتی ہوں۔ میں اس لائق ہوں ہی کہاں کہ کوئی مجھے پسند کرے اور چاہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ زماں صاحب کے پاس نہیں جائیں گے۔ میں آپ سے صاف صاف کہہ دیتی ہوں کہ وہ شخص مجھے ذرا بھی پسند نہیں ہے۔"

"تم درحقیقت میرے لئے کسی معمے سے کم نہیں ہو ناہید ـــــ"

"اور آپ کے لئے بہتر یہی ہے کہ اس معمے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کبھی نہ کریں۔"

"تمہاری مرضی۔ لیکن تمہیں اُداس و پریشان دیکھ کر مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔" ساجد نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"آپ کی عنایت کا بہت بہت شکریہ ۔۔۔ میرا کوئی تو ہے دنیا میں جو میری حالت دیکھ کر کڑھتا ہے۔ اچھا آیئے، آج ایک پکچر ہو جائے۔ تسنیم کو بھی ساتھ لے لیجیئے گا۔"

وہ خاموش رہا۔

چند دن اسی طرح گذر گئے۔ اس کا دل کہیں باہر جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے کمرے ہی میں رہتا تھا۔ تسنیم نے بھی اس عرصہ میں اپنی صورت نہیں دکھائی تھی۔ وہ ہمہ وقت ناہید کے پاس بیٹھی اس کی دلجوئی کرتی رہتی تھی۔ مگر اب اسے واپس پیچے جانا تھا۔ ویسے بھی وہ اس گھر میں زیادہ عرصے تک نہیں رہنا چاہتی تھی۔

"تم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم آج ہی جاؤ گی !" ناہید نے پوچھا۔

"ہاں ۔"

"مگر ۔۔۔ مگر پھر ساجد صاحب کا کیا ہوگا۔؟"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ مگر میری موجودگی سے تمہارے ارمانوں کا خون ہو سکتا ہے۔"

"تسنیم ۔۔۔ وہ افسردہ ہو جائیں گے ۔۔۔" ناہید نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہو جائیں ۔۔۔ مگر میں تمہیں رنجیدہ نہیں دیکھ سکتی۔ ساجد صاحب تو متلون مزاج ہیں۔ وہ ہر تتلی کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں۔ ہر پھول کی خوشبو

سونگھنے کی امید رکھتے ہیں۔ تم نے بتایا تھا کہ وہ پہلے کشور نامی کسی لڑکی کے دیوانے تھے اور اب میرے پیچھے پڑے ہیں۔ ایسے شخص کو تم کیا کہو گی ناہید۔؟"

ناہید خاموش رہی۔ کچھ نہیں بولی۔

"میں اسی لئے یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔ میں تمہاری راہ کا کانٹا بننا کسی طرح بھی گوارا نہیں کر سکتی۔ اور یہ بھی سن لو کہ میں آج ساجد صاحب سے ایک ایک بات صاف طور سے کہہ دوں گی۔ ان سے کہہ دوں گی کہ وہ مجھے پسند نہیں ہیں اور نہ ہی میں نے انھیں چاہا ہے۔"

"تسنیم ۔۔۔!" ناہید کا منھ حیرت کے باعث کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں ۔۔۔ اور میں یہ بھی کہہ دوں گی کہ تم ان کی پوجا کرتی رہی ہو۔ تم انھیں جتنا چاہتی ہو، شاید ہی کوئی دنیا میں اس قدر کسی کو چاہے گا۔"

"تسنیم ۔۔۔! خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔" ناہید گڑگڑائی۔

"میں اب ہرگز چپ نہیں رہ سکتی۔ میں تجھے ہرگز موت کے منھ میں جاتے نہیں دیکھ سکتی۔"

تسنیم بپھر کر کھڑی ہو گئی۔ ناہید نے التجائی انداز میں اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔

"تسنیم، میں تیرے جذبات کی قدر کرتی ہوں۔ لیکن میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ ساجد صاحب جب تک خود میری حالت سے واقف نہیں ہو جاتے، میں خود سے کبھی ان سے نہیں کہوں گی ۔۔۔ تو نے اگر ذرا بھی گڑبڑ کی تو یاد رکھ، تو مجھے زندہ نہیں پائے گی ۔۔۔ بس اس سے آگے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

تسنیم سکتے کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے

اور آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ ناہید کو وہ ایک ٹک دیکھتی رہی اور پھر دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ ناہید کے پہلو میں بھی آخر پتھر کا کلیجہ نہیں تھا۔۔۔ ہمدردی کی چوٹ برداشت نہ کرتے ہوئے وہ بھی اس کے شانے سے سر ٹکا کر زار و قطار رونے لگی۔

وہ شام بہت اداس تھی جب کہ تسنیم کا بستر باندھا جا رہا تھا۔ ساجد اس وقت کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ جب وہ بنگلے میں داخل ہوا تو حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات اس کے چہرے پر چھا گئے۔

"یہ۔۔۔ یہ کون جا رہا ہے ناہید۔۔۔؟" اس نے بمشکل پوچھا۔

"تسنیم جا رہی ہے۔۔۔" ناہید نے نیچی نظریں کئے جواب دیا۔

"ت۔ تسنیم۔ ا۔ مگر کیوں۔؟"

"اسی سے پوچھئے۔"

ناہید کی طرف اس نے شاکی نظروں سے دیکھا اور پھر تیزی سے تسنیم کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ سوٹ کیس میں اپنے کپڑے رکھ رہی تھی۔ ساجد کو دیکھ کر اس نے نظریں جھکا لیں۔

"تم جا رہی ہو تسنیم۔؟"

"جی۔" مختصر سا جواب۔

"مگر تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ تمہارے جانے سے کسی کے دل پر کیا بیتے گی۔"

"ہاں۔۔۔ ناہید افسردہ تو ہے۔۔۔" جان بوجھ کر اس نے گفتگو کا رُخ موڑ دیا۔

"میں اپنے بارے میں کہہ رہا ہوں۔"

"ہاں — تکلیف تو آپ کو بھی ہو گی ۔ اتنے دنوں تک ساتھ رہا ہے ۔"

"مگر — مگر میں اِس ساتھ کو دائمی بنانا چاہتا ہوں تسنیم —" ساجد تقریباً چیخا ۔

"میں سمجھی نہیں ۔ " تسنیم حالانکہ سب سمجھتی تھی ۔

ساجد کرسی پر بیٹھ گیا ۔ اُسے کچھ دیر تک لگاتار دیکھتا رہا ۔ دراصل وہ سوچ رہا تھا کہ راز کو دل میں چھپانے سے جلن بڑھتی ہی جائے گی ۔ اس وقت آس پاس کوئی بھی نہیں ہے ۔ بہتر ہے کہ اس سکوت اور دل آویز تنہائی میں وہ تسنیم سے صاف صاف کہہ دے ۔ ہو سکتا ہے کہ تب وہ جانا ملتوی کر دے ۔

"دیکھو تسنیم — مجھے خود بھی گھما پھرا کر بات کرنے کی عادت نہیں ہے ۔ میں بس اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ جب سے تم ہمارے ہاں آئی ہو — اس گھر کے ساتھ ہی میرے دل کی مکیں بھی بن گئی ہو — مجھے کہنے دو کہ تمہارے بغیر میری حیات ادھوری ہے ۔ تمہاری آمد نے میرے گلستانِ دل پر بارش کے پہلے قطرے کا سا اثر کیا ہے ۔ میں تمہیں اپنے سے دور نہیں دیکھنا چاہتا ۔ میں — میں تمہیں اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں ۔"

"ساجد صاحب — یہ — یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں — ؟" مصنوعی حیرت !

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں — شاید تمہیں علم ہوگا تسنیم کہ میری زندگی کتنی بے کیف اور ویران سی ہے ۔ میں ایک خاردار پودے کی مانند ہوں ، جس سے کسی کو فیض نہیں پہنچا بلکہ وہ ہر کسی کا دامن تار تار کر دیتا ہے ، میں دنیا بھر کا ٹھکرایا ہوا انسان ہوں ۔ میں نے جس کسی کو بھی چاہا ، اسی نے مجھ سے منھ موڑ لیا ۔ !"

"مجھے معلوم ہے۔"

"میں۔ پُر ظلمت میں روشنی کی ایک ننھی سی کرن کے لئے بھٹکتا رہا ہوں۔ اور یہ کرنیں مجھے ہمیشہ ہلکی سی جھلک دکھا کر روپوش ہو گئی ہیں۔ میں محبت کا بھوکا ہوں تسنیم۔ کسی کی نگاہِ الفت کا امیدوار ہوں۔"

تسنیم خاموشی سے اُسے تک رہی تھی۔ اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔

"میں آج تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ جانے سے پہلے مجھے اتنا ضرور بتا دو کہ تمہارے دل میں میری کوئی جگہ ہے۔ تمہارے ناز و انداز اور برتاؤ نے حالانکہ مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے۔ مگر میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔"

"یہ سننے سے پہلے کیا آپ مجھے یہ بتائیں گے کہ کشور کے ساتھ آپ کا یہ سلوک کیسا رہے گا؟" تسنیم نے حوصلہ کر کے دریافت کیا۔

"کشور ۔۔۔!" الفاظ ساجد کے حلق میں پھنس گئے۔

"جی ۔۔۔!"

"تسنیم، میں مانتا ہوں کہ میں نے اس سے محبت کی۔ مگر اس نے بے وفائی کی۔ اس نے مجھے ایک خط بھی نہیں لکھا۔ وہ زماں کی بہن ہے اور زماں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اس کی بہن مجھ جیسے آوارہ اور شوریدہ سر انسان کے دامن سے بندھ جائے۔ ہو سکتا ہے کہ زماں نے خود ہی اُسے منع کر دیا ہو ۔۔۔ مگر تسنیم ۔۔۔ وہ مجھے خط لکھ سکتی تھی ۔۔۔ میرے پاس آ سکتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا ۔۔۔ وہ بے وفا نکلی۔ اور میں ہمیشہ کی طرح پھر بے وفائی کا شکار ہو گیا ۔۔۔"

تسنیم خاموش کھڑی رہی بولی کچھ نہیں۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں تسنیم۔ میرا دامن الفت کے پھولوں سے ہمیشہ خالی رہا۔ کیا تم اسے نہیں بھرو گی۔؟"

"ساجد صاحب مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ کا مقام میری نظروں میں کچھ اور ہی ہے ——" تسنیم نے دل پر جبر کر کے فیصلہ سنانے کا آغاز کیا۔

"کیا مطلب۔؟"

"مطلب یہ ہے کہ میں نے آپ کو اس نظر سے کبھی نہیں دیکھا جس نظر سے آپ مجھے دیکھتے رہے ہیں۔ میں آپ کو بھائی کی طرح سمجھتی رہی ہوں اور ہمیشہ ایسا ہی سمجھوں گی۔ مجھے شرمندگی ہے کہ یہ بات مجھے پہلے ہی بتا دینی چاہیئے تھی۔ مگر افسوس اس کا موقع نہیں مل سکا۔"

ساجد یک لخت کرسی پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا —— بھائی! —— یہ اس نے کیا سنا؟ —— اس کا سر چکرانے لگا۔ یہ لفظ اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسانے لگا۔ کمرہ اسے نظروں کے سامنے گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ الفاظ اس کے حلق میں آ کر اٹک گئے۔ گلدان میں لگے ہوئے شریر پھول اب اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ تسنیم پر اس نے ایک اداس نظر ڈالی اور بولا۔

"شکریہ تسنیم —— تم نے مجھے میرے مرتبے سے آگاہ کر دیا۔ میں بہت پست خیال کا انسان ہوں۔ تم نے میری آنکھیں کھول دیں —— مجھے معاف کر دینا ——"

اس کا جسم لرز رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ اگر کچھ دیر اور وہاں کھڑا رہا تو ضرور گر جائے گا۔ خود کو سنبھالتا ہوا اور خدا سے خاموش شکوہ کرتا ہوا وہ خاموشی سے باہر آ گیا۔ اس کے قدم بنگلے کے عقبی دروازے

کی طرف اُٹھنے لگے، اور پھر سب کی نظریں بچا کر وہ باہر سڑک پر آگیا۔

کالی کالی بدلیاں برق رفتاری سے اُس کی سمت اُمڈی آرہی تھیں۔ گہرے سیاہ رنگ کی بدلیاں اس کے نزدیک اس کے تازہ غم کا سوگ منانے آئی تھیں۔

فضا میں ہوا کی ذرا سی بھی رمق نہیں تھی جھیل کا پانی ساکت تھا۔ کنارے پر لگے ہوئے سورج مکھی کے پھول ساکت تھے۔ چیڑ کے درختوں کی ٹہنیاں بے بسی کے ساتھ نیچے لٹکی ہوئی تھیں۔ ننھے منے پرندے حیرت اور تعجب کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے۔

پورا ماحول اداس تھا۔!

اس کا دل اداس تھا تو پوری کائنات سوگ مناتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔!!

۲۳

تسنیم جا چکی تھی اور اب ساجد کی دلبستگی کے لئے ناہید اور محبوب کو چھوڑ گئی تھی۔ ناہید ہر لمحہ اُس کے ساتھ رہتی۔ اس سے زبردستی باتیں کرتی۔ اس کی توجہ بٹاتی۔ مگر ساجد کے دل کا کنول نہیں کھِل سکا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ کا ہلکا سا بھی پرتو نہیں پڑا — وہی رنج و غم — وہی محرومیاں اور وہی آہ و بکا اب ساجد کا سرمایۂ حیات بن چکا تھا۔

ناہید کو جو اندیشہ تھا وہ پورا ہو کر رہا۔ اُسے یقین تھا کہ ساجد کی

ایسی ہی حالت ہو گی۔ مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اپنے غم کو بھول کر وہ ساجد کے غم کو بہلانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر زخم مندمل نہیں ہوئے۔ ٹیس بڑھ گئی۔ دل کی چبھن میں اضافہ ہو گیا۔ اور شدید قسم کی تپش اس کے رونئیں رونئیں میں سرائیت کر گئی۔

ایسی حالت میں محبوب علی مجذوب کی سخت ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ کئی دن سے شکل کم دکھاتا تھا۔ مگر اب جو یاد کیا تو الہ دین کے دیو کی طرح فوراً حاضر ہو گیا۔ حسبِ معمول وہ اس وقت بھی مسکرا رہا تھا۔ جب اس سے دریافت کیا گیا کہ اتنے دنوں سے وہ کہاں تھا تو اس نے جواب دیا۔

"کیا عرض کروں کہاں تھا۔ اپنا ہی ایک شعر پڑھتا ہوں۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
خود ہماری خبر نہیں آتی!

بس ناہید صاحبہ سمجھ لیجئے کہ میری حالت بالکل اس شعر جیسی ہے کیوں ہے اس شعر جیسی یہ میں آپ کو پھر بتلاؤں گا۔"

"نہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتی ہوں۔" ناہید نے مسکرا کر کہا۔ "وجہ غالباً وہی آپ کی گلیدن ہو گی۔"

"وہی ہی ہی ——" مجذوب شرما گیا —— "آپ تو سب جانتی ہیں ——"

"لیکن اس کے باوجود آپ کو آنا تو چاہیئے تھا۔ تسنیم آپ سے ملے بغیر چلی گئی۔"

"جی ہاں۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ اگر میرے سامنے جاتیں تو میں انھیں ضرور روک لیتا۔ حیف صد حیف —— اپنا ہی شعر یاد آگیا۔

جانے والے سے ملاقات نہ ہونے پائی
دل کی دل میں ہی رہی بات نہ ہونے پائی۔"

"خیر میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" ناہید نے شعر کو نظر انداز کر کے کہا۔

"فرمایئے۔"

"آپ براہِ کرم اب ساجد صاحب کے ساتھ زیادہ رہا کیجیے۔"

"وہ تو میں رہتا ہی ہوں۔" مجذوب گھبرا گیا۔

"میں زیادہ رہنے کو کہہ رہی ہوں۔" ناہید نے لفظ زیادہ پر زور دیا۔

"بالکل۔ بالکل — لیکن دیکھئے مجھے پھر اپنا ہی ایک شعر یاد آ گیا۔
دیوانے کے ہمراہ بھی رہنا ہے قیامت
دیوانے کو تنہا بھی تو چھوڑا نہیں جاتا
کیوں نہیں چھوڑا جاتا۔ یہ میں آپ کو ...."

"سمجھ گئی سمجھ گئی۔" ناہید نے اس کی بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے آپ کے یا جس کسی کے بھی یہ اشعار ہیں بہت پسند آئے۔ امید ہے کہ میں نے آپ سے جو کچھ کہا ہے وہ آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔"

"خوب اچھی طرح سمجھ گیا ہوں — کیونکہ میں نے ہی کہا ہے کہ ؎
میں نے یہ مانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
کیوں ہے یہ میں آپ کو پھر کبھی ...."

بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ زماں ڈرائنگ روم میں داخل

ہونا دکھائی دیا۔

ناہید کی پیشانی پر سلوٹیں نمایاں ہو گئیں۔ مگر پھر اخلاقاً اس نے اُسے خوش آمدید کہا اور پھر سمٹ کر بیٹھ گئی۔

محبوب نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔

"آیئے آیئے زماں صاحب۔ وہ جو کہتے ہیں کہ

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

تشریف لایئے تشریف لایئے ——"

"میں آپ دونوں کی باتوں میں مُخل تو نہیں ہوا ——"! زماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ زماں صاحب۔ آپ بھلا کیوں مخل ہوتے؟" محبوب بولا۔

ناہید نظریں نیچی کیے خاموش بیٹھی تھی۔ زماں نے تاڑ لیا کہ غالباً اس کی آمد کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا گیا ہے۔

"آپ کہیئے ناہید صاحبہ، میری آمد آپ کے لئے بارِ گراں تو نہیں ہے ——؟"

"جی نہیں —— آپ کا گھر ہے شوق سے تشریف لا سکتے ہیں۔" ناہید نے جواب دیا۔

"ساجد کہاں ہیں۔ بہت عرصے سے نظر نہیں آئے۔"

ناہید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش رہی۔ اس کے بجائے محبوب بولا ——

"اُس کی مت پوچھئے زماں صاحب۔ ان دنوں وہ حضرتِ داغ بنا ہوا ہے۔ جہاں بیٹھ گیا، بس بیٹھ گیا — کیوں بیٹھ گیا۔ یہ میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا۔"

زماں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا۔

"بھئی آپ بھی خوب آدمی ہیں مجذوب صاحب۔ کہئے کوئی تازہ غزل ہوئی ہے کیا۔؟"

"غزل — اجی ایک کیا ہزاروں غزلیں کہہ ڈالی ہیں اتنے عرصے میں۔ کسی لڑکی کو بارش میں کتابیں سینے سے لگائے جاتے دیکھا، غزل ہو گئی۔ کسی کو سینما کے باہر لگی ہوئی تصویریں دیکھتے دیکھا، غزل مکمل سمجھئے — شبنم کے قطروں کو پتّوں پر ٹپ ٹپ گرتے دیکھا — فوراً غزل ہو گئی — غرض جناب ہر ہر قدم پر مصرع، ہر ہر گام پر غزل — آپ تشریف رکھئے حضرت — میں ابھی اندر سے اپنی بیاض لے کر حاضر ہوتا ہوں۔"

زماں کے دیوتا کوچ کر گئے۔ وہ جانتا تھا کہ مجذوب بغیر سریش لگائے چپک جاتا ہے۔ منع کرنے کے باوجود مجذوب تیزی سے اُٹھا اور بالائی منزل کی طرف ہو لیا۔ اس موقع کو غنیمت جان کر زماں نے ناہید سے کہا۔

"میں آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا تھا ناہید صاحبہ —"

"فرمائیے۔ اس وقت ہم دونوں تنہا ہی ہیں۔" ناہید سب سمجھتی تھی کہ زماں کیا کہے گا۔

"میں نے کافی دنوں سے آپ کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔"

"کمال ہے —" ناہید فراخ دلی سے ہنسی۔ "میں تو ہنستی ہی

رہتی ہوں۔ ابھی آپ کو ہنس کر دکھایا ہے۔"

"یہ بات نہیں دراصل میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ کے چہرے پر وہ رونق اور چمک نہیں ہے جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ آپ اندر سے افسردہ نظر آتی ہیں۔"

"فرض کر لیجئے اگر ایسا ہے بھی تو پھر۔؟"

"اتنے تغافل سے کام مت لیجئے۔ میں دراصل مطلب بیان کرنے میں بہت بزدل واقع ہوا ہوں۔ حالانکہ میرے پچاس ماتحت ہیں اور ان سب کی روح مجھ سے کانپتی ہے۔"

"میں بھی آپ سے کافی ڈرتی ہوں۔" ناہید مسکرائی۔

"اوہ ـــ" زماں نے شرمندہ ہو کر کہا ـــ "میں بھی بعض دفعہ بڑی اوٹ پٹانگ باتیں کر جاتا ہوں ـــ دیکھئے، آج دراصل میں اسی لئے یہاں حاضر ہوا تھا کہ آپ سے کچھ ضروری باتیں کروں۔"

"میں سُن رہی ہوں ـــ" ناہید نے لاپرواہی سے کہا۔

"میں اپنی بات کہنے میں زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔ مجھے صرف اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ میں خود کو بے حد خوش قسمت سمجھوں گا ـــ اگر آپ ـــ آپ ـــ"

"جی ـــ میں؟"

"اگر آپ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منسلک ہو جائیں ـــ" زماں نے بمشکل رُک رُک کر یہ فقرہ ادا کیا۔

"غالباً میں آپ کو پہلے بھی اس کا جواب دے چکی ہوں۔" ناہید نے نظریں اٹھائیں۔

"مگر میں تو نا امید نہیں ہوا۔"

"مجھے افسوس ہے زماں صاحب۔ میں خود کو اس لائق نہیں سمجھتی۔"

"مگر میں تو سمجھتا ہوں کہ آپ کیا ہیں۔"

"شادی بیاہ کا معاملہ دراصل دلوں کی ہم آہنگی کے ساتھ ہی روحوں کے ارتباط کا نام ہے۔ میں نے آپ کو کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔ میں اس عزت افزائی کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ لیکن فی الحال میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"آپ میرا دل توڑ رہی ہیں۔!"

"مجبوری ہے ——" ناہید نے صاف جواب دیا۔

"کیا مجبوری ہے؟"

"میں عرض نہیں کر سکتی۔ بس یوں سمجھئے کہ فی الحال میرا خیال اس طرف نہیں ہے۔"

"آپ نہ بتائیں لیکن میں آپ کی مجبوری کو جانتا ہوں ——" زماں نے اُسے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا —— کیا جانتے ہیں؟" ناہید کے دل میں چور تو تھا ہی۔ وہ اچانک گھبرا گئی۔

"ساجد —— آپ ساجد کو چاہتی ہیں۔"

ناہید کو سکتہ ہو گیا۔ وہ خاموش رہی۔

"لیکن ساجد آپ کو صرف بہنا کی طرح سمجھتا ہے ——" زماں نے مزید کہا۔ اُس کے دل میں آپ کے لئے وہ چاہت نہیں ہے جو آپ کے دل میں اُس کے لئے ہے۔"

"زماں صاحب!" ناہید لرزتی ہوئی آواز میں چیخی —— "آپ اپنے

ہوش میں تو ہیں !"

"میں قطعی ہوش میں ہوں۔ اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ ساجد آپ کو کبھی نہیں چاہے گا۔ آپ ہمیشہ اس آگ میں جلتی رہیں گی۔"

"آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔" ناہید نے اپنے حواس پر قابو پا کر نہایت سکون کے ساتھ کہا۔

"میں آپ کا دل دکھانے نہیں آیا۔ میں آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن اتنا کہنے سے باز بھی نہیں رہ سکتا کہ یوں اپنی زندگی کو روگ لگانے سے حاصل؟ آپ جس چیز کے پیچھے دوڑ رہی ہیں اسے کبھی نہیں پا سکتیں۔ آپ کو سہارے کی ضرورت پڑے گی اور میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں اتنا بُرا نہیں ہوں جتنا کہ آپ سمجھتی ہیں۔"

"آپ ــــ آپ مجھے تنہا چھوڑ دیجئے ــــ" ناہید کے لب کپکپا رہے تھے ــــ

"میں آپ کو حقیقت کا آئینہ دکھا رہا ہوں۔ آپ میری باتوں کو جھٹلا نہیں سکتیں۔ آپ سوچ لیں۔ میں انتظار کر لوں گا۔"

"نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں کسی کی نہیں ہو سکتی۔ مجھے تم سب سے نفرت ہے، ہر مرد سے نفرت ہے۔ چلے جاؤ۔ میں کہتی ہوں چلے جاؤ۔"

ناہید بپھر گئی تھی۔ اسے خود بھی احساس نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ عالم بے اختیاری میں وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ زماں اب کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے چند لمحے تک اسے غور سے دیکھا اور پھر کہا

"بہتر ہے ــــ مجھے میری اوقات کا پتہ چل گیا۔ لیکن یاد رکھئے میں اتنی آسانی سے آپ کا دامن چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ آپ میری زندگی ہیں اور

میں اپنی زندگی سے دور رہنا نہیں جانتا۔ آپ ساجد کی کبھی نہیں ہو سکتیں۔ وہ کبھی مجھے پسند نہیں کرتا۔ لیکن میں کوشش کروں گا کہ اس کا دل جیت لوں تبھی میں آپ کو حاصل کر سکتا ہوں۔"

زماں نے اتنا کہہ کر دروازے کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ محبوب کی آواز آئی۔

"ارے آپ جا رہے ہیں۔ یہاں کم بخت بیاض ڈھونڈنے میں اتنا وقت برباد ہوگیا۔ اور ملی بھی تو نالائق پیاز کی ٹوکری میں سے۔ ارے بھئی رکئے۔"

"میں پھر سنوں گا۔ فی الحال اجازت دیجئے۔"

اتنا کہہ کر زماں تو چلا گیا اور محبوب ناہید کو غور سے دیکھنے لگا جسکی پیشانی پر برہمی کی ان گنت لکیریں اس کے دلی جذبات کو ظاہر کر رہی تھیں۔ پہلے تو اس نے کچھ بولنا چاہا مگر پھر اسی میں اپنی عافیت سمجھی کہ ناہید کو اس کے حال پر چھوڑ کر باہر چلا جائے۔

۲۴

ساجد کی وحشت اور درماندگی میں پھر سے اضافہ ہوگیا تھا۔ ناہید کے حکم کے مطابق محبوب ہر ہر قدم پر اس کے ساتھ ہوتا مگر ساجد ہمیشہ کنّی کاٹنے کی سوچتا۔ اس دن وہ تنہا تھا اور یہ تنہائی بھی اس لئے میسر ہوئی تھی کہ نشیبی سڑک پر محبوب کو گلبدن نظر آگئی تھی اور وہ ایک سیکنڈ کا وقت لے کر اس کے پاس

چلا گیا تھا۔ ساجد کے لئے یہی وقت غنیمت تھا۔ وہ مال روڈ عبور کر کے مسطح فلیٹ پر آگیا۔ وہاں پر چہل قدمی کرتے ہوئے چہرے ہشاش بشاش دکھائی دیتے تھے اور ساجد کو ان دنوں کسی کی مسکراہٹ بھی زہر لگتی تھی۔!

سنہری کلس والے مندر کے پہلو میں ایک سڑک بل کھاتی ہوئی آسمان کی سمت جارہی تھی۔ غروب آفتاب کا حسین منظر دیکھنے کے لئے سیاح یہاں ایک خوبصورت سی بنچ پر آکر بیٹھ جاتے تھے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو یہ حسین چوٹی اداسی کی کہر میں لپٹی ہوئی تھی۔ اور اِدھر اُدھر کوئی بھی نہیں تھا ——— شدید قسم کی ویرانی کا تسلط تھا۔ ایک طویل سرد آہ بھر کر وہ خالی بنچ پر بیٹھ گیا۔

اچانک کہر سمٹ گئی ——— شبک چوٹیاں آہستہ آہستہ نارنجی ہونی شروع ہوئیں۔ کوئی نہایت بلندی سے دیکھتا تو اسے ایسا لگتا گویا پورے خطے کو کسی نے سنہری سنجاف سے ڈھک دیا ہو!

آفتاب غروب ہو رہا تھا اور قوس قزح کے سے رنگ آسمان میں ہر سُو بکھر گئے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑے آفتاب کو دیکھ رہا تھا۔ چپ چپ سا۔ افسردہ ملول ——— دل میں آندھیاں اُٹھ رہی تھیں ——— یہ آفتاب اب چھپ جائے گا ——— اور پھر اُس کی زندگی کا سورج بھی اسی طرح اندھیروں کی آغوش میں منھ چھپا لے گا ——— پھر کبھی طلوع نہ ہوگا ——— کبھی نہیں ——— کبھی نہیں!

اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ دو بوندیں گریں اور پھر سیلِ اشک رواں ہوگیا۔

آسمان پر اچانک سیاہ بدلیاں اُمنڈ آئیں!

یہ بدلیاں اپنی قبا میں ہزاروں طوفان چھپا کر لائی تھیں۔!

دیکھتے دیکھتے اتنی خُنک ہوا چلی کہ کوئی دوسرا ہوتا تو پناہ لینے کی خاطر تیزی سے نیچے بھاگ جاتا۔ لیکن وہ خاموشی سے اُسی بنچ پر بیٹھا رہا۔

اور پھر بادل دل کھول کر اس کی بے بسی اور ناکام الفت پر روئے۔!

ہواؤں نے نوحے سنائے۔

لیکن وہ اسی مقام پر جم کر بیٹھا رہا ـــــ بیٹھا رہا اور بھیگتا رہا۔ تپتے ہوئے دل کی تپش ان چھینٹوں سے سہ گنی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں اور وہ نیم دراز ہو گیا۔ بجلی کڑک رہی تھی اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا تھا۔ آدھ گھنٹے بعد بارش رُک گئی۔ اور چوٹی پر ایک گہرا سکوت چھا گیا ـــــ اور پھر کچھ ہی دیر بعد چند شیریں قہقہے اس سکوت کو توڑنے آپہنچے۔ ہلکا سا اُجالا تھا اور اس اجالے میں ان لڑکیوں کے ساتھ آنے والے نوجوان نے ساجد کو دیکھ لیا۔

لڑکیوں کی نظر جب اس پر گئی تو سہم کر رہ گئیں۔

"کون ہے یہ ـــ ؟" ایک بولی۔

"ہائے یہ تو بارش میں بھیگتا رہا۔" دوسری نے کہا۔

"بیچارہ غمزدہ نظر آتا ہے۔" تیسری آواز۔

"زندگی سے بیزار معلوم ہوتا ہے۔" نوجوان نے منھ پھیر لیا۔

اور جب انھوں نے اُسے اٹھانا چاہا تو سردی کے باعث وہ اکڑ کر رہ گیا تھا۔ جسم پر ہاتھ لگایا تو آگ۔!

"اسے تو بڑا تیز بخار ہے۔" ایک لڑکی نے تشویشناک لہجے میں کہا۔

"چھوڑو بھئی ـــــ واپس چلتے ہیں۔ مر مرا گیا تو ہماری مصیبت آجائیگی۔" نوجوان بولا۔

"نہیں نہیں۔ ہمیں اتنا سنگ دل نہیں بننا چاہیئے۔" تیسری لڑکی نے پھر ہمدردی ظاہر کی۔ "انھیں نیچے لے چلو۔ جب انھیں ہوش آجائے گا تو ان کے ہوٹل میں پہنچا دیں گے۔"

"مگر اسے لے کر کون چلے گا۔؟" نوجوان نے منہ بنالیا۔

"تم ہی لے کر چلوگے اور کون ۔۔ ؟" ایک شوخ لڑکی بولی ۔۔۔ "سوچو مت، اسے اپنے کندھے پر سوار کر لو یا پیٹھ پر ۔۔ مگر خدا کے لئے جلدی کرو۔"

نوجوان نے ناک چڑھائی اور پھر مجبوراً اُسے لڑکیوں کا کہا ماننا پڑا۔ نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا وہ آہستہ آہستہ ساجد کو کمر پر لادے ہوئے نیچے آنے لگا۔

بوڑھا پوسٹ ماسٹر، ڈاک خانے کے باہر بنے ہوئے جنگلے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اور پہاڑی انداز میں ہاتھوں کی چلم بنا کر سگرٹ پی رہا تھا۔ رنگ برنگی ساڑھیوں میں لپٹے ہوئے دہکتے جسم چہل قدمی کر رہے تھے۔ بہت سی خوبرو اور حسین و نازک خواتین ڈانڈیوں میں سوار تھیں۔ اچانک پوسٹ ماسٹر کی عقابی نظروں نے ایک ڈانڈی میں چت لیٹے ہوئے ساجد کو دیکھ لیا۔ شاید نیچے آکر نوجوان نے ڈانڈی لے کر ساجد کو اس میں لٹا دیا تھا۔

اپنا جلتا ہوا سگرٹ پھینک کر پوسٹ ماسٹر بڑی بے تابی سے ڈانڈی کے قریب آیا۔

"ساجد صاحب ! ۔۔ کیا ہوا انھیں۔ ؟"

"آپ انھیں جانتے ہیں کیا۔ ؟" نوجوان نے پوچھا۔ "کون سے ہوٹل میں مقیم ہیں یہ۔ ؟"

"ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ مگر انھیں کیا ہوا ہے؟"

"یہ چوٹی پر بارش میں پڑے بھیگ رہے تھے ــــــ" ایک لڑکی نے جواب دیا۔

"اوہ ــــــ!" پوسٹ ماسٹر نے کہا۔ "آپ کا شکریہ کہ آپ انھیں نیچے لے آئیں۔ آپ تکلیف مت کیجئے میں انھیں ان کی کوٹھی پر لے جاؤنگا۔"

"کوکوٹھی پر ــ!"

"ہاں ــ یہ ایک بہت بڑے آدمی کے بھتیجے ہیں ــ"

نوجوان کو اس ناخوشگوار فرض سے سبکدوشی حاصل کر کے بیحد خوشی ہوئی اور وہ لڑکیوں کو ساتھ لے کر واپس چلا گیا۔ پوسٹ ماسٹر نے ساجد کی پیشانی چھو کر دیکھی تو وہ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔! اس نے سوچا کہ کتنا بے وقوف نوجوان ہے جو لڑکیوں کی یادوں کے سہارے جینے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ وقت کے بے رحم ہاتھ اسے مسلنے پر تلے ہوئے ہیں۔ بیوفائیوں نے اس کے دل میں ناسور ڈال دیئے ہیں۔ مگر یہ کتنی خود فریبی کا شکار ہے! چپ چاپ آنکھیں پونچے جاتا ہے۔

رات کا ڈیڑھ بجا تھا۔ اور وہ کمرے میں بالکل اکیلا تھا۔ ڈاکٹر نے سخت ہدایت کی تھی کہ اُسے زیادہ سے زیادہ آرام پہنچایا جائے۔ اس کے سر پر گیلی پٹیاں رکھی جا رہی تھیں اور یہ کام ناہید انجام دے رہی تھی۔ صرف وہی تنہا اس کی تیمارداری کر رہی تھی۔ نجمی صاحب اور محبوب گیارہ بجے ہی وہاں سے اُٹھ کر جا چکے تھے ــــــ

اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن ذہن جاگ رہا تھا۔ کچھ نیم خوابی کی سی

کیفیت تھی۔ بجلی کے آتش دان سے نکلتی ہوئی راحت بخش ہلکی سی گرمی اُسے بے حد سکون پہنچا رہی تھی۔ اس کے ذہن کے اوراق بکھرے ہوئے تھے۔ لاشعور میں عجیب عجیب خیالات آرہے تھے۔ ناہید کی موجودگی کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ غیر مسلسل یادوں کی یلغار ہوئی جارہی تھی۔ تخیّل اُسے لے کر اُڑ رہا تھا اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ ایک انجانی سی شاہراہ پر جا رہا ہے۔ ایسی شاہراہ پر جو آگے جاکر دبیز دھند میں روپوش ہو جاتی ہے۔ روشنیاں جھلملا رہی ہیں اور ستارے بار بار ٹوٹ رہے ہیں۔ ستاروں میں سے ایک بے حد روشن ستارہ اس کے قریب آتا جا رہا ہے — قریب — اور قریب — اور پھر بہ نظر غور دیکھنے سے ستاروں کی پالکیوں میں اسے ناہید بیٹھی ہوئی نظر آئی — اُس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ ستارے پھر ٹوٹنے لگے اور پالکی بیکراں خلاء میں کھو گئی۔ ! اُس کا رواں رواں لرز گیا اور اُسے یوں لگا گویا وہ خلاء کی وسعتوں میں ڈوبتا جا رہا ہے۔

"ساجد — ساجد، یہ تمہیں کیا ہو گیا؟"

ہلکی سی مرتعش آواز آئی۔ جیسے کوئی خلاء کی گہرائیوں میں سے بولا ہو۔ — وہ چپ چاپ لیٹا رہا اور پھر ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے گالوں پر بکھرنے لگے۔

اتنی تپش! — میرے اللہ! میرے گالوں میں اتنی تپش!

اس کی انگلیاں کسی نرم اور گداز شے سے مس ہونے لگیں۔ دل و دماغ پر ایک سرور سا طاری ہوتا گیا۔ چہرے پر کوئی ملائم چیز آہستہ آہستہ سرائیت کرنے لگی — نرم سی شے، گرم سی چیز!

"تم سنتے ہو! — ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو — میں ہوں میں۔"

اُسے احساس ہوا کہ وہ اس آواز کو پہچانتا ہے۔ مگر نیم خوابیدہ ہونے کے باعث آواز والی کو دیکھ نہیں سکتا۔

"کیا میں تمہارے خوابوں میں کبھی نہیں آتی ساجد — ! آہ تم نے آج تک میرے دل میں جھانک کر نہیں دیکھا — تم مجھے کیا سمجھ رہے ہو؟"

ہر شے دھندلی ہونے لگی۔

ظلمت کی ایک وسیع چادر ہر سمت میں پھیل گئی۔

اس نے خود سے کہا — یہ کون ہے؟ کون ہے جو مجھے پکار رہا ہے — کس نے آواز دی ہے مجھے —؟

جواب میں کچھ سسکیاں آہیں اور دردملی ہچکیاں اُسے سنائی دیں اور اس کے گالوں پر پھر سے جیسے کھولتا ہوا لاوا گرنے لگا۔ اور پھر اس کے ہاتھوں پر کسی نے دو دہکتے ہوئے انگارے رکھ دئے۔

یہ کیا ہے — اس میں تو میرے جسم سے بھی زیادہ حدت ہے — ! یہ گرم مرطوب شے کسی کے جلتے ہوئے ہونٹ تو نہیں ہیں۔؟

"میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی ساجد — دیکھ لینا ایک دن ضرور مر جاؤں گی —"، دہی دُور کنوئیں میں سے آتی ہوئی آواز — "کوئی دوسرا ہوتا تو کبھی کا سمجھ گیا ہوتا۔ مگر ہائے، تم آج تک نہیں سمجھے — ساجد، میرے ساجد آنکھیں کھولو۔"

اس آواز میں اتنا درد و کرب تھا کہ اس نے ساجد کے تحت الشعور کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اتنی بے کسی اور بے بسی تھی کہ اس کی روح تڑپ اٹھی — ذہن کے خوابیدہ تار جھنجھنا اُٹھے — اس کے دماغ پر کسی نے تازیانے برسانے شروع کر دیئے — خلا کی وسعتوں سے اب وہ نیچے گرنے لگا۔ ذہن کے دریچے

وا ہوتے گئے ـــ اور پھر ان دریچوں پر پڑے ہوئے دبیز پردے کھلتے گئے ـــ کھلتے گئے۔ حریری پردوں کے عقب سے ایک ... دھندلی سی شکل ابھری ـــ ساجد نے محسوس کیا، کوئی اس کے چہرے کے بالکل قریب بیٹھا ہوا آنسو بہا رہا ہے۔

اس نے نقاہت سے بھرپور آنکھیں کھولیں۔ اور وہ دھندلی صورت فوراً پیچھے ہٹ گئی۔ کوئی چیز اس کے گالوں پر رینگ رہی تھی۔ ہاتھ سے اُس نے اپنے گالوں کو چھوا ـــ گرم گرم پانی کے قطرے تھے ـــ تو کیا وہ رو رہا ہے؟ مگر خوابیدہ حالت میں وہ کیسے رو سکتا ہے ـــ وہ تو غالباً بیہوش تھا ـــ پھر ـــ پھر ـــ ؟

"شکر ہے آپ کو ہوش آگیا۔؟" ناہید نے یہ کہتے ہوئے مرمریں انگلیوں سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔

"مجھے ـــ مجھے کیا ہوا ہے؟" کمزور سی آواز میں اس نے پوچھا۔

"آپ کو سرسام ہو گیا تھا ـــ اب آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"سرسام ـــ اوہ!" ساجد نے اتنا کہنے کے بعد اُسے غور سے دیکھا۔ "مگر ـــ مگر میرے یہ گال گیلے کیوں ہیں ـــ کیا پسینہ بہت آیا تھا ـــ ؟"

"نہیں یہ پسینہ نہیں ہے۔" حیا آلود لہجے میں ناہید نے کہا اور پھر حنائی انگلیوں سے ساجد کے گال پر بہتے ہوئے قطرے پونچھ دیئے۔

"پھر ـــ ؟"

"کچھ نہیں ـــ"

"سمجھ گیا ـــ" ساجد نے فہمائشی لہجے میں کہا ـــ "یہ تم مجھ جیسے احمق

کے لیے رو تی رہی ہو۔ !"

"کیا مجھے رونے کا بھی حق نہیں ہے۔؟" اُس نے دانتوں سے نچلے ہونٹ دبا لیا۔

"میں تو پاگل ہوں ناہید — اور اس پاگل پر تم نے بڑے احسان کئے ہیں۔ اُسے بارہا موت کے منہ سے بچایا ہے۔ تم نے رشتہ داری کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔"

نقاہت بھری آواز میں ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے رُک رُک کر یہ جملے کہے۔

"تمہارے اور چچا کے علاوہ اور رہتے ہی کون میرا — لیکن میں کسی کا نہیں ہوں — کسی کا بھی نہیں —" ساجد کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"اپنا جی چھوٹا مت کیجئے — میں خبر گیری نہیں کرتی تو پھر کون کرتا؟ — ابا اور محبوب بڑی دیر تک یہاں بیٹھے رہے تھے۔ وہ دونوں بھی بہت پریشان ہیں —"

"میں بھی کتنا نالائق ہوں — اتنے لوگوں کو پریشان کیا —" وہ افسردگی سے مسکرایا۔ "اور میں — میں تمہارے لئے کچھ بھی نہیں کر سکا۔"

"آپ اچھے ہو جائیں — میرے لئے یہی بہت ہے۔ میں آپ کو کس قدر چاہتی ہوں، آپ یہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ پھر اس طرح کی باتیں کر کے کیا آپ میری اور ابا کی محبت کا مذاق نہیں اُڑا رہے ہیں —؟" ناہید نے ذومعنی لہجے میں اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"میں جانتا ہوں، خوب جانتا ہوں ناہید —" ساجد نے مدھم آواز میں کہنا شروع کیا۔ "مجھے احساس ہے کہ تمہارے اور چچا کے بغیر میری زندگی ادھوری رہتی — وقت کے بے رحم ہاتھوں نے مجھے مسل کر رکھ دیا ہوتا —

تم نے مجھے زیبا جیسی محبت دی اور چچا نے باپ کی سی الفت ـــ میں تمہارا ممنون ہوں ناہید۔ میں ان احسانوں کا بدلا کبھی نہیں اتار سکتا ـ ہرگز نہیں اتار سکتا۔"

اس نے اپنی کہنی آنکھوں پر رکھ لی اور اپنے آنسوؤں کو چھپا لیا۔ اُدھر ناہید سہم کر رہ گئی ـــ تو کیا یہ اب بھی نہیں سمجھے؟ اُف معبود! ـــ اب وہ کیا کرے، کہاں جائے؟ کس طرح ان کے دل میں اپنا دل ڈالے ـــ کیا وہ یونہی تڑپتی رہے گی۔ محبت کی ایک ننھی سی کرن کی تلاش میں اسی طرح رواں دواں رہے گی۔؟

کیا وہ خود ہی رازِ دل آشکارا کر دے ـــ اپنے آپ ہی دل چیر کر اُن کے قدموں میں رکھ دے، بتا دے ان کو کہ وہ ان کے بغیر جی نہیں سکتی۔ لیکن کیا یہ مناسب ہوگا، اتنا وقت گذر جانے کے بعد اب اس کا یہ اقدام کیسا رہے گا۔ نامناسب ہی ہوگا۔ دل کی بات کہنی تھی تو بہت پہلے کہہ دینی چاہیئے تھی ـــ لیکن اب اب ـــ اب تو وقت گذر چکا ہے پگلی ـــ!

وقت گذر گیا تو کیا ہوا، اس کی زبان بند رہی تو اس سے کیا ـــ وہ تحریر کا سہارا لے سکتی ہے، وہ روزانہ انھیں کاغذ پر حالِ دل لکھ بھیجے گی۔ کبھی تو ان کا دل پسیجے گا ـــ کبھی تو اس کے بے برگ و گل چمن میں بہار آئے گی۔ بس یہی مناسب ہے۔ وہ کل رات ہی ان کے نام ایک پرچہ تحریر کرے گی ـــ اب یہ اس کی قسمت کہ اُن کی نگاہوں کے محلات سے ذلیل کر کے نکال دیجائے یا ان محلات میں متمکن ہو جائے۔!

۲۵

ساجد کو رو بصحت ہونے میں کئی دن لگ گئے اور اس عرصے میں مجذوب اس کے بیحد قریب رہا۔ اس کی بذلہ سنجی سے ساجد کو کافی آرام ملا۔ ناہید اب اس سے دُور دُور رہتی۔ قریب آتی تو مضمحل اور افسردہ سی — جیسے بادِ سموم کے تھپیڑے کھائی ہوئی کوئی کلی ہو — تیمارداری وہ اسی تندہی سے کرتی رہی اور انتظار کرتی رہی کہ کب ساجد بالکل تندرست ہو اور وہ رازِ دل تحریر کی صورت میں اُسے بھیجے — ساجد کے نام اس نے کئی پرچے لکھ رکھے تھے۔ مگر اُسے دینے کی نوبت ابھی تک نہیں آئی تھی — صرف وقت اور موقع کا انتظار تھا۔

ناہید کی نظروں میں اپنی وقعت اور اہمیت بڑھانے کی خاطر زماں بھی ایک دن بنگلے پر آیا۔ ناہید اس وقت باغ کی روش پر اکیلی ٹہل رہی تھی —

"حاضر ہو سکتا ہوں۔"

ناہید کی پیشانی پر ناگواری کی لکیریں نمایاں ہو گئیں۔

"میں ساجد کو دیکھنے حاضر ہوا تھا۔ اب کیسی طبیعت ہے اُن کی۔"

"اچھے ہیں ___" مختصر سا جواب۔

"آپ بھی اچھی ہیں؟" زماں نے اُسے دزدیدہ نظر سے دیکھا۔

"ہوں۔"

"آپ نے میرے بارے میں کچھ غور کیا ناہید صاحبہ؟"

"غالباً میں آپ کو جواب دے چکی ہوں ____" اس نے ٹکڑا توڑ کر جواب دیا۔

"یاد ہے مجھے ___" زماں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ کے خیال میں اگر ایسا ہونے لگے تو چکور کبھی چاند تک نہیں پہنچے، پروانہ کبھی شمع پر نثار نہ ہو اور بھنورے کبھی کلیوں پر نہ منڈلائیں۔"

"بھنورا لالچی ہوتا ہے زماں صاحب ___" ناہید اُسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"سبھی انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔"

"خیر میں بحث میں پڑنا نہیں چاہتی۔ میں آپ کو جواب دے چکی ہوں۔"

ناہید اتنا کہہ کر سیڑھیوں پر چڑھنا ہی چاہتی تھی کہ زماں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ناہید نے گھور کر دیکھا اور پھر زماں نے خجل ہو کر بازو چھوڑ دیا۔

"معافی چاہتا ہوں ___ لیکن کیا آپ میری درخواست پر نظرثانی نہیں کر سکتیں؟"

"کس لئے؟"

"موت کی سزا کے مستحق کو بھی اپیل کا حق ہوتا ہے — آپ میری التجا کو اپیل ہی سمجھ لیں۔"

زماں اتنا کہہ کر حسرت بھری نظروں سے ناہید کو دیکھنے لگا۔ ناہید نے متعجب انداز میں اسے دیکھا۔ چند لمحے تک کچھ سوچا اور پھر اوپر چڑھنے لگی۔

"وکیا میں ناکام واپس چلا جاؤں؟"

"مجھے افسوس ہے زماں صاحب۔" ناہید نے قدم بڑھا...

"سنئے — !" زماں کے اتنا کہتے ہی وہ رک گئی۔

"میں بہت سی ایسی باتیں جانتا ہوں جن کا افشا آپ ہرگز پسند نہیں کریں گی۔"

ناہید نے حیرت بھری نظریں اس پر ڈالیں اور جاتے جاتے رک گئی۔

"جی ہاں — میں جانتا ہوں کہ آپ ساجد کو اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہیں۔ لیکن وہ آپ کو نہیں چاہتا۔"

"یہ آپ پہلے بھی مجھے سنا چکے ہیں۔ مطلب کیا ہے؟"

"مطلب یہ ہے کہ آپ جان بوجھ کر رازِ دل اُس پر منکشف نہیں کرتیں۔ آپ ڈرتی ہیں۔"

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے — اگر ایسا ہے بھی تب آپ کو کیا؟"

"آپ اس لئے ڈرتی ہیں کہ آپ کی فطری شرم وحیا، وہ شرم وحیا جس سے مجھے والہانہ پیار ہے — آپ کو ایسا کرنے سے روکتی ہے۔ آپ صنفِ نازک ہیں اور یہ نہیں چاہتیں کہ اپنی زبان سے اپنی محبت کا اظہار کریں۔"

"زماں صاحب — !" ناہید کے لہجے میں کرب تھا۔

"آپ جانتی ہیں کہ اگر آپ نے ایسا کیا تو ساجد کی نظروں میں آپ کی

کوئی وقعت نہ رہے گی۔ وہ یہاں سے چلا جائے گا اور ایسا ہو گیا تو پھر آپ کو اپنے محبوب کی قربت نہیں حاصل ہو سکے گی۔"

"آپ — آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" ناہید کے لبوں کے گوشے لرز رہے تھے —

"ساجد آپ کو بہن کی طرح چاہتا ہے —" زماں نے بات جاری رکھی۔ "لیکن اگر اسے آپ کی چاہت کا علم ہو گیا تو جانتی ہیں آپ کیا ہو گا — اس کے ارمانوں کا خون ہو جائے گا۔ اُسے اتنی ندامت ہو گی کہ وہ زندگی بھر آپ سے نظریں نہ ملا سکے گا۔ آپ سے دُور دور رہے گا اور اس کے دُور چلے جانے سے آپ کی امیدوں اور آرزوؤں کا جنازہ نکل جائے گا۔"

"ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔" ناہید کی پلکیں زمیں بوس تھیں۔ "میں زندہ نہ رہ سکوں گی۔"

"اسی لئے میں کہتا ہوں کہ آپ میری التجا مان لیجئے اور زندگی کو روگ مت لگائیے۔"

"نہیں — میں ایسا بھی نہیں کر سکتی۔"

"بس تو پھر اب میں وہی کروں گا جو میں نے سوچ رکھا ہے۔" زماں آگے بڑھنے لگا۔

"کیا —؟" ناہید نے گھبرا کر اسے روک دیا۔

"میں ساجد سے آپ کے بارے میں سب کچھ کہہ دیتا ہوں۔"

"نہیں — نہیں آپ ایسا نہیں کر سکتے۔" اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گذر گیا۔

"کون روک سکتا ہے مجھے — میں ساجد سے بھی کہوں گا اور نجمی صاحب

سے بھی۔ پھر پورے پہاڑ کو علم ہو جائے گا۔ سب طرف آپ ہی کے چرچے ہوں گے۔ لوگ کہیں گے کہ بھائی کی محبت کا اچھا صلہ دیا ہے نجمی صاحب کی لڑکی نے — پھر آپ جس طرف سے گذریں گی لوگ انگلیاں اٹھائیں گے اور کہیں گے . . . . "

"بس کرو۔ بس کرو — خدا کے لئے خاموش رہو۔" ناہید نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بھینچ لئے۔ اس کا رواں رواں لرز رہا تھا اور چہرے پر چھایا ہوا کرب، اندرونی حالت کا غماز تھا۔

"آپ اپنی رائے نہیں بدل سکتیں اور میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں — "

"نہیں نہیں —" آنکھیں ڈبڈبا آئیں،

"اگر آپ کی راہ جدا ہے تو میں بھی اپنا راستہ نہیں بدل سکتا۔"

"خدا کے لئے مان جائیے، میری مجبور و بیکس زندگی سے فائدہ مت اٹھائیے۔"

ناہید گڑگڑانے لگی اور زماں نے لوہے کو گرم پاکر پھر چوٹ لگائی۔

"میں خود بھی مجبور ہوں ناہید صاحبہ —"

"میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں —"

ناہید نے زماں کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ لئے اور زماں نے جلدی سے ان ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ وہ ناہید کو اس اقدام سے باز رکھنا چاہتا تھا، مگر اسی موقع پر اچانک ساجد کمرے سے باہر آگیا اور اس نے یہ منظر دیکھ لیا۔ اس کے لب متبسم ہو گئے اور وہیں سے بولا۔

"میں نے بہت کچھ دیکھ لیا ہے۔"

ناہید نے سہم کر اپنے ہاتھ چھڑا لئے اور زماں مسکراتا ہوا ساجد کی

طرف بڑھا۔

"میں تمہاری طبیعت پوچھنے آیا تھا ساجد۔"

"میری یا ناہید کی ـــــ؟" ساجد نے مسکرا کر پوچھا اور ناہید نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر اس سے پہلے کہ مزید کوئی بات ہو وہ جلدی سے وہاں سے جانے لگی۔

"ٹھہرو ناہید ـــــ" ساجد نے پکارا اور وہ رک گئی ـــــ "بیٹھ جاؤ۔"

لان میں کچھ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، وہ تینوں اُن پر بیٹھ گئے۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ناہید۔"

"جی کہیئے۔"

"آخر یہ آنکھ مچولی کب تک ہوتی رہے گی۔"

"آنکھ مچولی ـــــ مگر ـــــ مگر ـــــ"

"اور زماں صاحب ـــــ آخر یہ کیا طریقہ ہے ـــــ آپ میری بہن کا ہاتھ مانگنے کے لئے مجھ سے یا چچا سے دریافت کر سکتے تھے۔"

"دراصل میں سوچ رہا تھا....." زماں نے کنکھیوں سے ناہید کو دیکھا۔

"میں عرصے سے ناہید کو غمزدہ و افسردہ دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے آج جو اس کا ہاتھ پکڑا ہے وہ کیا پہلے نہیں پکڑ سکتے تھے ـــــ کیا آپ کو علم ہے کہ آپ کی بے اعتنائی نے ناہید کو کتنا دکھ پہنچایا ہے ـــــ؟" ساجد نے شرارت بھری نظروں سے ناہید کو دیکھا۔ وہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔

"میں نے کبھی بے اعتنائی نہیں کی۔ ناہید صاحبہ ہی تغافل کرتی رہیں۔" زماں پھر مسکرایا۔

"ناہید — یہ کیا سُن رہا ہوں میں —؟"

"مجھے ایسی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں — میں جاتی ہوں —"، ناہید نے اُٹھنا چاہا۔

"شرمانے کی کیا ضرورت ہے — میری اپنی خواہش بھی یہی ہے کہ یہ رشتہ ہو جائے۔"

"آپ نے غلط اندازہ لگایا ہے۔ جو آپ سوچ رہے ہیں وہ بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے —؟"، ساجد نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

"میں بتاتا ہوں —" زماں جلدی سے بولا۔ "بات یہ ہے کہ ناہید صاحبہ دراصل ...... کیوں، کہہ دوں —؟"

تخاطب ناہید کی طرف تھا — وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور ملتجیانہ انداز میں اُس نے زماں کو دیکھا۔

"بات کیا ہے آخر —؟"، ساجد اب بھی حیرت سے اُن دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"ہے کچھ ایسی ہی بات — رفتہ رفتہ تمہیں معلوم ہو ہی جائے گی"، زماں نے کہا —

ناہید اب نہیں رُک سکی اور گھبرا کر جلدی سے بالائی منزل پر جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"آپ نے کچھ کہہ دیا ہے زماں صاحب؟"، ساجد نے پوچھا۔

"ہاں — آج مجھ سے خفیف سی ناراض ہو گئی ہیں — اچھا اب میں بھی چلتا ہوں، پھر آؤں گا۔"

اتنا کہہ کر زماں بھی کھڑا ہو گیا۔ اور اس کے جانے کے بعد ساجد بڑی دیر تک گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا، مگر سب بے سود، وہ خاک بھی تو نہ سمجھا۔

پہلے اس نے کشور کو بھلانے کی کوشش کی تھی اور اب تسنیم کو بھلا رہا تھا۔ اس کے مقدر میں یہی لکھا تھا کہ اوّل وہ کسی کو چاہے اور پھر اُسے بھلانے کی جدوجہد کرے۔ ناہید اس کے سامنے پڑنے سے حتی الامکان گریز کرتی اور وہ یہ سوچ کر مسکراتا رہتا کہ اس نے ناہید کی چوری پکڑ لی ہے۔ اسی لئے وہ شرمندہ ہے اور شرم کے باعث اس سے آنکھیں نہیں ملاتی۔

نجمی صاحب ان دنوں اپنے جنگلات میں تھے اور اُن باتوں سے بالکل لاعلم تھے جو اُن کی غیر حاضری میں وقوع پذیر ہو چکی تھیں۔ محبوب کو اپنی گلبدن سے ہی فرصت نہیں تھی۔ لہٰذا اس تنہائی سے اُکتا کر ایک دن ساجد اس پکی سڑک پر ہو لیا جو لہراتی ہوئی نشیب میں جا رہی تھی اور جس پر گاہے گاہے کچھ موٹریں آتی جاتی دکھائی دے جاتی تھیں۔

وہ لگاتار نشیب میں اترتا چلا گیا۔ شاید آگے بھی جاتا اگر سڑک پر چند لکڑیاں کھڑی کر کے راستہ روک نہیں دیا گیا ہوتا۔ دراصل آگے کی سڑک بارش کے باعث شکستہ ہو گئی تھی اور ایک عارضی موڑ دے کر سڑک کو بائیں سمت کر دیا گیا تھا۔ ساجد کو اچھی طرح یاد تھا کہ سڑک سے کچھ ہی آگے ایک قدرتی آبشار تھی اور آبشار سے کچھ ہی فاصلے پر ایک سرنگ کا دہانہ۔ وہ مقام اسے بہت پسند تھا۔ اُس نے سوچا کہ آگے چل کر دیکھنا چاہیئے کہ سڑک کہاں سے ٹوٹی ہے۔ اگر وہ ٹھیک حالت میں ہوئی تو پھر وہ آبشار تک

ضرور جائے گا اور دیکھے گا کہ اس کی روانی اب کیسی ہے۔؟

یہ سوچ کر وہ لکڑیوں کی عارضی روک کو پھلانگتا ہوا، سیدھی سڑک پر پہنچ گیا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی لکڑی سے سہارا لیتا ہوا آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔۔۔

آبشار کا روح پرور شور اب صاف سنائی دے رہا تھا۔ گنجان درختوں کے درمیان میں سے سیال چاندی کی ایک دیوار اُسے صاف نظر آرہی تھی۔ ایسے مناظر پر وہ دم دیتا تھا اور قدرت کو اس کی صناعی پر دل ہی دل میں ایک خاموش داد دیا کرتا تھا۔ آبشار کی خنک پھوار کے بالکل قریب پہنچنے پر وہ ایک پتھر کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ آبشار آسمان کی بلندیوں سے جنم لے کر نشیب میں گر رہی تھی۔ اور وہ اس نشیب کے کنارے ہی پر کھڑا ہوا تھا۔ اُس کی پشت پر ایک اونچا پہاڑ تھا جس پر وہ پہاڑی سڑک بلندی کی طرف چڑھ رہی تھی جسے چھوڑ کر وہ نیچے آیا تھا اور جس کی مرمت مزدور کر رہے تھے۔

وہ دنیا سے بے خبر، خاموش کھڑا ہوا اپنی روح میں تراوٹ گھول رہا تھا لیکن پشت والے پہاڑ سے دو آنکھیں اُسے غصّے سے گھور رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں نفرت کا سیلاب امڈا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ زماں اس کو اسی وقت سے دیکھ رہا تھا جب کہ وہ نشیبی سڑک پر اُتر کر آبشار کی طرف آرہا تھا۔ انجنیئر زماں پہاڑی سڑک کو ٹھیک کرانے کی خاطر وہاں مصروفِ عمل تھا۔ بڑے بڑے وزنی پتھر اٹھانے کے لئے سڑک پر ایک کرین بھی لگی ہوئی تھی۔ کرین کا آہنی پنجہ نیچے لٹک رہا تھا اور زماں اس وقت کرین کے ڈرائیور کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔

ساجد کو یوں تنہا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس نے

کرین ڈرائیور سے کہا کہ وہ فی الحال کام بند کر دے اور اسٹور میں جا کر اُس کا انتظار کرے۔ ڈرائیور نے حکم مانتے ہوئے وہ مقام چھوڑ دیا اور پھر اُس کے جانے کے بعد زماں خود اس کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ساجد اس مقام سے کوئی تیس میٹر دُور تھا۔ زماں اُس کو دیکھ کر اپنے ہوش میں نہ رہا۔ جلدی جلدی وہ ہونٹ دانتوں سے کاٹنے لگا۔ اُس کے دماغ میں گویا آندھیاں اُٹھ رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہی وہ شخص ہے جس کی وجہ سے ناہید اُسے اب تک نظرانداز کرتی چلی آئی ہے۔ یہی وہ انسان ہے جس کے باعث ناہید کبھی اُس کی نہیں ہو سکتی ــــ یہی وہ آدمی ہے جس کی زندگی میں زماں کے خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتے۔ اس کو دنیا سے اُٹھ جانا چاہیئے۔ زماں کو چاہیئے کہ وہ اُسے اپنے راستے سے ہٹا دے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس قصے کو ختم کر دے۔ اس کے عشق کی راہ میں جو انسان دیوار بن گیا ہے، اسے اپنی کرین کے آہنی پنجے سے گرا دے ــــ کوئی دیکھنے والا نہیں ہے ــــ سب کام میں لگے ہوئے ہیں ــــ بالکل یہی موقع ہے۔ اس سے اچھا موقع پھر شاید کبھی نہیں مل سکے!

اُس نے جلدی سے کرین کے انجن کا گیر تبدیل کیا اور زنجیر سے لٹکا ہوا آہنی پنجہ آہستہ آہستہ ساجد کی طرف بڑھنے لگا۔ اور جب یہ پنجہ ساجد سے صرف چند میٹر کی دُوری پر رہ گیا تو زماں گیر کو آزاد چھوڑ کر تیزی سے اپنی سیٹ سے کودا اور پھر پہاڑی سڑک پر بچھی ہوئی اپنی میز پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس طرح گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اور پھر فوراً ہی اس نے آنکھیں بھینچ کر دانت پر دانت جما لئے۔ ایک دلدوز چیخ بلند ہو کر آبشار کے شور میں مدغم ہو گئی، اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا ساجد جس جگہ کھڑا ہوا تھا، اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ زماں

کے ہونٹوں پر ایک بھیانک مسکراہٹ پھیل گئی ۔۔ جس کام کو اُس نے مشکل سمجھا تھا۔ وہ کتنی آسانی سے ہو گیا تھا۔

۲۶

آبشار کا متلاطم پانی پتھروں سے ٹکراتا اور مہیب شور پیدا کرتا ہوا، ایک بپھرے ہوئے چشمے کی صورت میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ پانی اتنا شفاف تھا کہ تہہ میں جمے ہوئے پتھر بالکل صاف نظر آتے تھے۔ گلبدن نے اپنے گلابی پیر اس چشمے میں لٹکا رکھے تھے اور محبوب اس کے جسم سے بالکل چپکا ہوا بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ اس نے گلبدن کے گلے میں حائل کیا ہوا تھا اور دوسرے سے خودرو پھول توڑ توڑ کر اس کے بالوں میں لگا رہا تھا۔

"بس بابو بس ۔۔ میں اتنے پھولوں کا کیا کروں گی ؟"، گلبدن شرمائی ہوئی تھی۔

"میں ۔۔۔ میں تمہیں مجسم بہار بنا دینا چاہتا ہوں گلبدن ۔۔ کیوں بنا دینا چاہتا ہوں، یہ میں تمہیں پھر کبھی بتاؤں گا ۔۔"، محبوب نے اس کے سیب جیسے گالوں کو چھو کر کہا۔

"تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں چلے جاؤ گے بابو۔؟"

"کون احمق چھوڑ کر جائے گا نہیں، ارے ظالم ایسی پُرشباب حسینہ کو چھوڑ کر کوئی کافر ہی جا سکتا ہے ۔۔ ہائے اپنا ہی ایک شعر پڑھتا ہوں۔

اُن کا شباب دیکھ کے ہوتا ہے یہ خیال
دنیا میں اب شباب کسی پر نہ آئے گا ۔"

"یہ تم بولتے بولتے گانے کیوں لگتے ہو بابو ــــ ؟" گلبدن نے اٹھلا کر پوچھا۔

"ارے تم وہ چیز ہو جسے دیکھ کر انسان تو کیا طیور لابیاں بھی گانے لگیں، کائنات جھوم کر راگنی چھیڑ دے، فضائیں مستی میں رقص کریں اور فطرت نغمہ سنج ہوجائے ــــ تمہیں کیا علم کہ تم کیا چیز ہو۔ اُف ! تم تو وہ ہو جس کے بارے میں میں نے فرمایا ہے۔

جب ہم چلیں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

کیوں چلے ــــ یہ تو میں پھر کبھی فرصت میں بتاؤں گا ــــ لیکن فی الحال تو بس میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ تم بہاروں سے بھی زیادہ حسین ہو۔ تمہارے دودھیا جسم سے خوشبوئیں جنم لے کر فضائیں بکھرتی ہیں۔ اگر تم روز نہایا کرو تو خوشبوئیں پوری دنیا میں بکھر جائیں۔ گلبدن تم تو وہ ہو جس کے بارے میں میرے ایک دوست شاعر نے میری غزل کا یہ شعر ایک مشاعرے میں سنایا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شعر جوش کا ہے لیکن میری پھلجھڑی، یہ میں نے فرمایا ہے اور کیا خوب فرمایا ہے کہ

ہم نے پھولوں کو چھوا، مرجھا کے کانٹے بن گئے
تم نے کانٹوں پر قدم رکھا گلستاں کر دیا ــــ"

"کانٹا ــــ !" گلبدن نے بھولپن سے کہا۔ "کیا پھول توڑتے وقت کوئی کانٹا چبھ گیا تمہارے ــــ ؟"

"اُف ! ــــ" محبوب نے سینہ پر ہاتھ مار کر کہا۔ "اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔"

چٹاخ چٹاخ کی دو آوازیں پیدا ہوئیں اور گلبدن سمٹ کر رہ گئی۔

محبوب مزید دست درازی کی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک اُسے چشمے کے دوسرے کنارے پر کچھ پتھر لڑھکتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اس نے گھبرا کر اوپر دیکھا تو کوئی چیز بلندی سے نیچے گرتی ہوئی نظر آئی۔ یہی وہ وقت تھا جب کہ آہنی پنجے نے ساجد کو کھڈ میں دھکیل دیا تھا۔ محبوب نے اوپر سڑک پر نظریں جمائیں تو اچانک چند خودرو جھاڑیوں کے درمیان میں سے زماں کرین سے کود کر اپنی جیپ پر جا کر بیٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ محبوب نے پھر فوراً ہی اُس چیز کو دیکھا جو لڑھکتی ہوئی نیچے آ رہی تھی اور پھر یہ اندازہ لگاتے ہی کہ وہ تو کوئی آدمی ہے، اُس کے گویا پر لگ گئے۔ گلبدن کو بڑی تیزی سے اپنے سے علیحدہ کر کے وہ چشمے میں کود پڑا۔ اور چند لمبی لمبی چھلانگوں میں اسے پار کر گیا، اس عرصے میں ساجد نیچے آ چکا تھا۔ ساجد کو پہچانتے ہی دنیا محبوب کی نظروں میں اندھیر ہوگئی۔ وہ بُری طرح گھائل تھا۔ پورا جسم لہو لہان ہو رہا تھا۔ محبوب ایک سیکنڈ میں سمجھ گیا کہ کیا ہوا ہے۔ اُس نے جلدی سے ساجد کو اٹھا کر کاندھے پر ڈالا۔ چشمہ پھر عبور کیا اور گلبدن کو ساتھ آنے کا کہہ کر برق رفتاری سے اُس پگڈنڈی پر چڑھنے لگا جس سے اُنز کر وہ اس چشمے تک آیا تھا۔

گلبدن خود بھی گھبرا گئی تھی اور اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ جلد ہی محبوب ایک کچّی سڑک پر پہنچ گیا۔ اس مقام سے نجی صاحب کا بنگلہ زیادہ دُور نہیں تھا۔ لیکن محبوب بنگلے پر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اُس کے خیال میں ساجد کو وادی میں شہر کے اسپتال میں پہنچانا بیحد ضروری تھا۔ پہاڑ سے وہ چھوٹا سا شہر تقریباً چالیس میل دُور تھا۔ اور یہ چالیس میل کا فاصلہ کس طرح طے ہو۔؟

اِسے اتفاق ہی سمجھئے کہ ایک سرکاری جیپ گاڑی کچی سڑک پر نمودار ہوئی دراصل یہ سڑک شارٹ کٹ کی حیثیت رکھتی تھی۔ جسے شہر تک جانا ہوتا وہ اسی

سڑک کو جلدی پہنچنے کے لئے ضرور استعمال کرتا۔ محبوب نے جیپ رکوائی اور ڈرائیور کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ شریف آدمی تھا وہ فوراً ساجد کو اسپتال پہنچانے کے لئے آمادہ ہو گیا۔

محبوب نے چلتے چلتے گلبدن کو ہدایت کردی کہ وہ اس واقعے کا تذکرہ کسی سے بھی نہ کرے۔ نجمی صاحب اور ناہید کو ہرگز معلوم نہ ہونا چاہیئے۔ گلبدن تو چلی گئی اور محبوب زخمی ساجد کا سر اپنے زانو پر رکھے ہوئے اُسے دیکھتا رہا۔ جیپ چلتی رہی اور محبوب سوچتا رہا ـــــ میں جان گیا ہوں میرے یار کہ تمہیں کس نے اس حالت کو پہنچایا ہے۔ میں زماں کو لاعلم رکھ کر اُس سے ضرور انتقام لوں گا ـــــ سخت انتقام لوں گا ـــــ میں اُسے کبھی یہ بات نہیں بتاؤں گا کہ اُسی نے تمہیں کھڈ میں پھینکا تھا ـــــ بس تم خدا کرے زندہ رہو، پھر دیکھنا۔ پھر دیکھنا ساجد!

اسپتال تک کا جان لیوا فاصلہ بڑی مشکل کے بعد کٹا۔ محبوب کو یوں محسوس ہو رہا تھا گویا چالیس میل نہیں چالیس ہزار میل کا فاصلہ ہو گیا ہو۔ راستے میں ساجد کا خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔ اس کی نبض ڈوبتی جا رہی تھی اور محبوب خدا سے ایک خاموش دعا مانگ رہا تھا۔ اسپتال میں ساجد کے کیس کو فوری طور پر لے لیا گیا اور محبوب کمرے سے باہر بیٹھا ہوا بے قراری سے ہاتھ ملتا رہا۔ جب ڈاکٹروں نے آکر بتایا کہ بازو میں فریکچر ہو گیا ہے لیکن خطرے کی کوئی بات نہیں۔ پلاسٹر باندھ دیا گیا ہے تو محبوب کی جان میں جان آئی اور وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتا رہا۔

ایک ہفتے کے بعد ساجد اس قابل ہو گیا کہ اُٹھ کر بیٹھ سکے۔ محبوب نے رات کو رات اور دن کو دن نہیں سمجھا اور درحقیقت دوستی کا حق ادا کر دیا۔

وہ چوبیس گھنٹے ساجد کے سرہانے بیٹھا رہتا تھا۔ شاعری کا بھوت ذہن سے اُتر چکا تھا اور اب ہر وقت وہ زماں سے بدلہ لینے کی سوچتا رہتا تھا۔ اُس کے خیال میں اُس نے گلبدن کو یہ راز کسی سے نہ کہنے کے لئے کہا تھا تو درست ہی کیا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو ناہید کو بڑی تکلیف ہوتی۔ محبوب کے خیال میں ناہید زماں کو چاہتی تھی اور جب اسے یہ علم ہوتا کہ اُس کے محبوب نے اُس کے عزیز بھائی کو قتل کرنے کی کوشش کی ہے تو یقیناً اس کی زندگی اجیرن ہو جاتی۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود محبوب یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ زماں نے ساجد کو قتل کرنے کی کوشش کیوں کی۔ لے دے کے صرف یہی ایک بات اس کے دماغ میں آتی تھی کہ زماں دراصل ساجد کا اپنی بہن سے ملنا جلنا شروع ہی سے ناپسند کرتا تھا چنانچہ اُس دن موقع پا کر اُس نے ساجد کو اپنے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک روح فرسا خبر اور تھی جو محبوب ساجد کو سنانے سے گریز کرتا تھا۔ حادثے کے تین دن بعد ہی اُسے اسپتال میں یہ اطلاع ملی تھی کہ نجمی صاحب جنگلات کے اندر موجود تھے۔ مزدوروں کی لاعلمی میں ایک اونچا درخت، جب کہ مزدور اُسے آرے سے کاٹ چکے تھے، اُس طرف گرا تھا جدھر نجمی صاحب چار پانچ مزدوروں کے درمیان میں کھڑے ہوئے تھے۔ درخت کو اپنی طرف آتے دیکھ کر جب وہ مزدوروں کو بچانے کے لئے بڑھے تو اُن کے ساتھ ہی کچلے گئے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں تھے اور محبوب کو یہ بالکل علم نہ تھا کہ یہ اندوہناک خبر سُن کر ناہید کے دل پر کیا بیتی ہوگی۔ اُسے تو یہ فکر تھی کہ یہ اطلاع وہ ساجد کو کس طرح دے گا؟

ساجد کو پہلے کی نسبت بہتر پا کر محبوب اُس کے لئے کچھ ضروری سامان

خریدنے کے لئے بازار میں پہنچا ___ اور پھر جب سامان خریدنے کے بعد وہ تھیلیوں سے لدھا پھندا ایک سائیکل رکشا کی تلاش میں تھا، اچانک اُس کی نظر دو لڑکیوں پر پڑی جو اسٹیشن پر بس کے انتظار میں کھڑی ہوئی تھیں۔ اس جگہ سے اوپر جانے کے لئے بسیں ملا کرتی تھیں اور وہ لڑکیاں یقیناً اوپر جانا چاہتی تھیں۔ صبح سے شام تک ان گنت لڑکیاں محبوب کی نظروں کے سامنے سے گذرتی تھیں، مگر ان دو لڑکیوں پر خصوصی توجہ دینے کی وجہ یہ تھی کہ اُن لڑکیوں میں سے ایک یقیناً کشور تھی!

کشور۔! جس کے فراق میں ساجد کی یہ حالت ہوئی تھی، جس کی وجہ سے زماں اُسے قتل کرنے کے درپے تھا۔ جس نے آج تک پلٹ کر ساجد کی خبر نہیں لی تھی ___ وہی کشور اب ہشاش بشاش اُس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ سامان رکشا میں رکھنے کے بعد وہ قدم بڑھا کر کشور کے نزدیک آیا ___ کشور نے اُسے دیکھا اور پھر بڑی بے تابی سے اُس کے قریب آئی۔

"آپ ___ آپ محبوب صاحب، آپ یہاں کیسے؟"

"یہی سوال میں آپ سے بھی پوچھ سکتا ہوں کشور صاحبہ ___"

"یہ ___ یہ میری چھوٹی بہن ہے فرزانہ ___ بس اس کے ساتھ اوپر جارہی ہوں ___"

"زماں صاحب کو اطلاع نہیں دی آپ نے ___ وہ جیپ نیچے بھیج دیتے ___؟"

"نہیں ___ میں اچانک پہنچنا چاہتی تھی ___ بھیا کو بتانا نہیں چاہتی کہ میں آرہی ہوں ___" کشور نے کہنا شروع کیا ___ "میں آپ کو بتا نہیں سکتی محبوب صاحب کہ میں کتنی مجبور تھی ___ لیکن آج میں بڑی خوش ہوں ___ سچ کہتی ہوں، بہت

خوش ہوں ۔"

"ٹھیک ہے ۔۔ ہونا بھی چاہیئے ۔" محبوب نے مایوسی سے کہا۔" آپ اتنے دن بعد زماں صاحب سے ملیں گی ۔ کیوں ملیں گی، یہ میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا ۔"

"ہاں ۔۔ لیکن ۔۔" کشور نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر فرزانہ کی موجودگی کو محسوس کر کے چند قدم آگے بڑھ آئی اور پھر آہستہ سے بولی ۔" مگر بھیّا سے ملنے کے علاوہ بھی تو مجھے کسی اور سے ملنے کی تمنّا ہے ۔۔ آپ تو جانتے ہی ہیں ۔۔"

"بیشک جانتا ہوں، لیکن یہ خیال آپ کو اتنے دن بعد کیوں آیا ؟"

" یہ ایک طویل کہانی ہے محبوب صاحب، کبھی فرصت میں سناؤں گی۔ بس مختصراً یوں سمجھئے کہ میں ایک قید خانے میں بند تھی۔ امّی اور ابّا مجھے جانے نہیں دیتے تھے ۔ چند دن پہلے ہی مجھے علم ہوا ہے کہ در اصل بھیّا نے جیلر کے فرائض انجام دیئے تھے ۔"

"زماں صاحب نے ۔۔ !" محبوب کو بڑی حیرت ہوئی ۔

"ہاں ۔۔ انھوں نے ابا کو لکھ دیا تھا کہ میری نگرانی کی جائے ۔ میرے نام کوئی خط آئے تو اُسے چیک کیا جائے اور مجھے پہاڑ پر نہیں بھیجا جائے ۔" کشور کی آنکھیں بھر آئیں ۔

" یہ تو بہت بُرا ہوا ۔ ساجد کو تو یہ خیال رہا کہ آپ نے اُس سے بیوفائی کی ہے ۔"

"میں بے وفا نہیں ہوں ۔ سچ کہتی ہوں میں بے وفا نہیں ہوں ۔۔ میں مجبور تھی محبوب صاحب ۔ میں لڑکی ذات ہوں لہٰذا بے بس تھی ۔ میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ اتنا عرصہ میں نے کیسے بِتایا ہے ۔ میں اتنا روئی ہوں کہ آنکھوں

کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔"

"میں مانتا ہوں۔ اب مجھے یقین آگیا، لیکن اس سے زماں صاحب کو کیا فائدہ ہوا؟"

"وہ میرا اور ساجد کا ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ انھوں نے میرے معاملات میں دخل اندازی نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر پھر بھی نجانے انھوں نے یہ پابندی کیوں لگائی۔"

کشور نے آنکھوں کے گوشے رومال سے پونچھے اور محبوب کو اس پر رحم آنے لگا۔

"اب میں بغاوت کر کے آئی ہوں۔ والدین نے جان بوجھ کو فرزانہ کو میرے ساتھ کر دیا ہے تاکہ میرے ہر غلط اقدام کی اطلاع اُن تک پہنچ جائے۔" کشور نے کنکھیوں سے اپنی بہن کو دیکھ کر کہا۔

"مجھے آپ سے ہمدردی ہے ___ کیوں ہے یہ میں آپکو ....."

"اب میں ساجد سے جا کر معافی مانگ لوں گی۔ وہ بہت اچھے دل کے انسان ہیں۔ مجھے ضرور معاف کر دیں گے۔"

محبوب گردن جھکائے کچھ سوچتا رہا اور پھر مسکرا کر بولا۔

"آپ کو اوپر جانے کی ضرورت نہیں، میں آپ کو ساجد سے یہیں اِسی شہر میں مِلوا سکتا ہوں۔"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ ___ ؟" کشور نے ایسے کہا گویا اُسے دولت مل گئی ہو۔

"مگر اس کے لئے ایک شرط ہے۔"

"کیا ___ خدا کے لئے جلدی کہیئے ___ مجھے ہر شرط منظور ہے۔ ایک ایک

بات منظور ہے ۔"

"آپ اب ساجد کو چھوڑ کر نہیں جائیں گی ـــــ"، محبوب نے آہستہ سے کہا۔

"کبھی نہیں ـــــ ہرگز نہیں ـــ میں آپ کو اس کا یقین دلاتی ہوں"

"بس تو پھر میرے ساتھ آئیے ۔"

اتنا کہہ کر محبوب نے دوسری رکشا کی اور اس میں دونوں بہنوں کو بٹھا کر رکشا والے سے اپنی رکشا کے پیچھے پیچھے آنے کو کہا۔ راستے میں وہ سوچتا رہا کہ یہ بات کہ زماں کے ایک خطرناک اقدام سے ہی ساجد اپنی موجودہ حالت کو پہنچا ہے، وہ کشور کو کبھی نہیں بتائے گا۔ بلکہ کشور اور ساجد کو ایک دوسرے سے ملا کر وہ زماں سے خاموش انتقام لے گا۔ زماں کو جب معلوم ہو گا کہ اُس نے ہی اُن دونوں کو ملوایا ہے تو یقیناً وہ انگاروں پر لوٹے گا۔ اُسے سیخ پا دیکھ کر محبوب کو کتنی خوشی ہو گی ۔ !

محبوب نے ایک بات اور بھی سوچی تھی۔ نجمی صاحب کی دردناک موت کے بارے میں وہ زیادہ عرصے تک ساجد کو لاعلم نہیں رکھ سکتا تھا۔ مگر کشور کے مل جانے سے یہ مسئلہ بخیر و خوبی حل ہو سکتا تھا۔ ساجد کشور کو پا کر بیحد خوش ہو گا محبوب کو اس کا یقین تھا اور اس نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ دونوں کے ملاپ کے کچھ ہی دیر بعد وہ یہ روح فرسا خبر ساجد کو سنا دے گا۔ کمزوری کے باعث ساجد پہاڑ پر جا بھی نہ سکے گا اور اس غم کو کشور کی پیاری پیاری باتیں ضرور ساجد کے دل سے دُور کر دیں گی ۔

ساجد صبح کا اخبار پڑھنے میں منہمک تھا جبکہ محبوب جنرل وارڈ میں سے گذرتا ہوا اس کے بستر کے قریب پہنچا۔ کشور کو وہ دانستہ پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وہ چاہتا

تھا کہ اچانک سب کچھ ہو اور ساجد اُسے دیکھ کر بوکھلاہٹ میں جو حرکات کرے وہ اس سے لطف اندوز ہو۔

"کہاں مر گئے تھے ــــ ضرور کوئی شاعر مل گیا ہوگا ؟" ساجد نے شکوہ کیا۔

"یار شعر کے سلسلے میں تو یہ بڑی سنگلاخ زمین ہے۔ ویسے میں ایک زندہ شعر اپنے ساتھ لے آیا ہوں ــــ کیوں لے آیا ہوں، یہ میں تمہیں..... "

"زندہ شیر ــــ کیا کہہ رہے ہو ؟"

"اُس حادثے نے تمہیں اتنا ناکارہ کر دیا ہے کہ تم الٹا سننے لگے ہو ــــ ارے بھائی شیر نہیں شعر ــــ شعر ــــ عین والا۔"

"اچھا ــــ لیکن میں سمجھا نہیں ــــ ؟"

"اچھا یہ بتاؤ کہ اگر کوئی کھوئی ہوئی چیز کافی دن بعد تمہیں مل جائے تو تم خوش ہو گے یا نہیں ــــ ؟"

"ممکن ہے کہ مجھے خوشی ہو ــــ کہہ نہیں سکتا۔"

"اور پھر فوراً ہی میں تمہیں ایک بُری خبر سناؤں، تب تمہاری کیا حالت ہو گی ــــ ؟"

"کون سی بُری خبر ہے ــ جلدی بتاؤ ــــ" ساجد گھبرا گیا۔

کشور جب اسپتال میں داخل ہوئی تھی تو اس نے محبوب سے یہ سوال ضرور کیا تھا کہ آخر وہ کیوں اُن دونوں کو اسپتال میں لے کر جا رہا ہے۔ محبوب کا جواب یہی تھا کہ پہلے وہ ایک شخص سے ملاقات کر لے بعد میں ساجد کے پاس چلے گا۔ وہ باہر دروازے میں کھڑی بار بار کلائی پر بندھی ہوئی ننھی سی گھڑی کو دیکھ رہی تھی۔ انتظار کی تکلیف اب ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔

وہ فرزانہ کو ساتھ لے کر اندر آنا ہی چاہتی تھی کہ محبوب اُسے بلانے آگیا۔
"کہاں ہیں وہ — ؟" کشور نے بیقراری اور خوف کے ملے جلے لہجے میں کہا۔ "سچ بتلائیے، میرا دل کہہ رہا ہے کہ کوئی اور ہی بات ہے۔"
اور تب محبوب نے اسے پوری بات بتا دی۔ احتیاطاً زماں کا نام نہیں بتایا۔ کشور کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ اُسے فرزانہ کی موجودگی کا بھی احساس نہیں رہا محبوب کے ساتھ تقریباً دوڑتی ہوئی وہ ساجد کے پاس پہنچی۔ دو بچھڑے ہوئے دلوں کا ملاپ بھی دیدنی تھا۔ الفاظ اس وقت کی حالت بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ تو وہی سمجھ سکتا ہے جس کے دل نے محبت کی پُر حلاوت انی اپنے دل میں چبھتی ہوئی محسوس کی ہو۔ جس کی اداس راتیں کسی مہ جبیں کے حسین تصور سے باتیں کرتی گذری ہوں اور جو بازیٔ عشق میں بارہا مات کھانے کے بعد ساجد کی طرح سے جیتا ہو۔!
شکوے شکایات کے دفتر کھل گئے۔ حالات کو کوسا گیا۔ زماں کو بُرا بھلا کہا گیا اور زمانے کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا۔ محبوب فرزانہ کو اپنے ساتھ لے کر دانستہ باہر چلا گیا اور تب کشور نے اشکوں میں ڈوبی ہوئی آواز میں اُس سے کہا۔
"میں اب آپ کو یہاں ہرگز نہیں رہنے دوں گی۔ آپ آج ہی یہاں سے چلیے —"
"مگر میں کہاں جاؤں گا کشور — ؟"
"ہم ادیپر چلتے ہیں۔" کشور نے عاجزانہ انداز سے کہا۔
"زماں اسے مناسب نہیں سمجھیں گے اور پھر نہ جانے کیا بات ہے کہ محبوب بھی مجھے ادیپر جانے سے منع کر رہا ہے۔"

"بس تو پھر لکھنؤ چلیئے — میں اب کسی سے نہیں ڈرتی، میں امّی ابّا سے آپکو ملواؤں گی۔ وہ دل کے بہت اچھے ہیں۔ میری پسند ان کی پسند ہوگی۔ یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔"

لمبی چوڑی بحث کے بعد آخر یہی طے پایا کہ ساجد کشور کے ساتھ لکھنؤ چلے، اور وہاں کسی ہوٹل میں مقیم ہو۔ کشور اس کی خبر گیری کرتی رہے اور پھر ایک دن اپنے والدین کو اس کے بارے میں بتلا کر اُن سے اپنی محبت کی بھیک مانگے۔

محبوب کو جب یہ بات بتلائی گئی تو اُس نے بھی صاد کیا۔ البتہ فرزانہ کی طرف سے سب کو تشویش تھی۔ فرزانہ سے دریافت کرنے سے بیشتر سب نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ مسکرائی اور بولی۔

"آپا، میں سب سمجھتی ہوں، اتنی بچّی نہیں ہوں۔ میں نے ہی امّی ابّا کو یہ کہہ کر راضی کیا تھا کہ وہ آپ کو اوپر جانے دیں، میں ساتھ میں رہوں گی۔ میں جانتی تھی کہ آپ کیوں جا رہی ہیں اور اب یہ بھی جان چکی ہوں کہ کیوں نہیں جانا چاہتیں۔"

کشور حیرانی سے اُسکی یہ گفتگو سنتی رہی۔ فرزانہ اُسے شرارت سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"آپ اس لئے نہیں جانا چاہتیں کہ اب دولہا بھائی آپ کو مل گئے ہیں۔

محبوب نے ایک قہقہہ لگایا۔ ساجد مسکرانے لگا اور کشور شرم سے سُرخ ہوگئی۔

۲۷

اور پھر دوسرے ہی دن وہ چاروں فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں لکھنؤ کی سمت محوِ سفر تھے۔ راستے میں کشور اور فرزانہ جب نیند کی آغوش میں چلی گئیں تو محبوب نے رازدارانہ انداز میں ساجد کو گزشتہ واقعات بتانے شروع کئے۔ زماں کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا کہ دراصل اُسی شخص نے ساجد کو کھڈ میں گرایا تھا۔ یہ سنتے ہی گویا ساجد کے حواس مختل ہو گئے۔ وہ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ آخر ایسا کس طرح ہو سکتا ہے.؟

"میرے یار اس دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔" محبوب نے کہا— "کیوں ہو سکتا ہے یہ میں پھر کبھی بتلاؤں گا۔"

"نہیں محبوب، میں دراصل یہ سوچ رہا ہوں کہ جبکہ زماں کو علم تھا کہ میں کشور سے کنارہ کش ہو گیا ہوں، تب اس نے ایسا کیوں کیا۔ یہ اقدام تو اُسے اس وقت کرنا چاہیئے تھا جبکہ کشور نے مجھے گھر بلایا تھا اور زماں نے میری

بے عزتی کی تھی۔ اتنے عرصے تک وہ خاموش کیوں رہا؟"

"بس تم اسے ضد سمجھ لو ـــــ غالباً میں نے ہی کبھی یہ شعر کہا تھا کہ

ایک محبت ہی سے ہے ضد سب کو
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا !۔"

محبوب کی زبان سے اِس سنجیدہ موقع پر شعر سُن کر ساجد جھنجھلا گیا، اور بولا۔

"تم بلا ضرورت اشعار پڑھتے رہتے ہو۔ میں تم سے سوچنے کے لئے کہہ رہا ہوں اور تم وقت ضائع کر رہے ہو؟"

"وقت ضائع نہ کروں تو پھر کیا کروں۔" محبوب نے ذرا فہمائشی انداز اختیار کیا۔ "تم تو ہو گئے ہو پاگل۔ ارے بندۂ خدا جب کشور دوبارہ مل گئی ہے تو اب تمہیں اور کیا چاہیئے۔ پچھلی باتوں کو بھول جاؤ اور نئی زندگی کا آغاز کرو۔ رہا زماں، تو اُس سے فرصت میں بدلہ لے لیا جائے گا۔ میرے نزدیک تو یہی بہترین انتقام ہے کہ تم چپ چپاتے کشور سے شادی کر لو۔ زماں اگر کوئلوں پر نہ لوٹ جائے تو میرا ذمّہ ـــــ۔"

اور پھر لکھنؤ پہنچنے کے بعد کشور کے گھر سے بہت ہی قریب ایک ہوٹل میں وہ دونوں مقیم ہو گئے۔ ساجد افسردہ تھا لہٰذا محبوب بڑی دیر تک اس کی دلبستگی کی باتیں کرتا رہا اور پھر کچھ ہی دیر بعد اس نے نجمی صاحب کے بارے میں اُسے بتایا۔ ساجد کو جیسے یہ سُن کر سکتہ ہو گیا۔ اُس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ آنسو رواں ہو گئے اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ـــــ اضطراری کیفیت اتنی شدت اختیار کر گئی کہ اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ بڑی دیر تک یہی حالت رہی۔ محبوب نے بہت دلاسے دیئے مگر نجمی صاحب جیسے

شفیق چچا اور بزرگ دوست کا غم اتنا ہلکا نہیں تھا کہ ساجد اُسے ایک لمحے میں بھول جاتا۔ وہ بار بار اُن کی باتیں یاد کرتا تھا اور پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا تھا۔

"سامان باندھو محبوب، میں ابھی وہاں جاؤں گا ــــ ناہید کا خیال کرو، وہ تو زندہ درگور ہوگئی ہوگی۔" اُس نے اشک بہاتے ہوئے کہا۔

"نادان مت بنو ساجد، تم ابھی بہت کمزور ہو، اتنا طویل سفر نہیں کرسکتے۔"

"مگر میں جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔ ناہید کو تسلی دینے والا کوئی نہیں ہے ــــ۔"

"یہ میں مانتا ہوں مگر ڈاکٹروں کی ہدایت کے بموجب تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔" محبوب نے اُسے زبردستی بستر میں لٹاتے ہوئے کہا۔

"ناہید کو میری بھی بہت فکر ہوگی ــــ وہ سوچتی ہوگی کہ نہ جانے میں کہاں چلا گیا ہوں۔ وہ یہ دوسرا غم برداشت نہ کرسکے گی محبوب۔"

"دیکھو ساجد ضد نہ کرو ــــ میری مانو تو اس کا بھی ایک طریقہ ہے۔"

"کیا ــ؟" ساجد نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ناہید کو پہلے تار اور پھر ایکسپریس خط ڈال دیتے ہیں۔ اِس طرح وہ تمہارے بارے میں جان بھی جائے گی اور اس کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہوجائیگا۔ کیسوں ہوجائے گا، یہ میں تمہیں پھر کبھی بتاؤں گا۔ خط میں تم بے شک یہ ذکر کردینا کہ تم اِن دنوں کشور کے شہر ہی میں ہو۔ لیکن یہ تاکید کردینا کہ یہ از

ناہید زماں پر ظاہر نہ کرے۔"

"زماں وہاں کب آتا ہوگا۔؟"

"ضرور آتا ہوگا۔ ناہید کا دل جیتنے کا اِس سے اچھا موقع اُسے اور کوئی نہیں ملے گا۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔ میں ابھی خط لکھتا ہوں۔ تم اتنے ڈاکخانے جا کر تار دے آؤ۔"

ساجد نے اتنا کہہ کر پیڈ اُٹھا کر قلم نکالا اور اُسے لکھتے دیکھ کر محبوب نے دروازے میں سے کہا۔

"یار ذرا گلبدن کی خیریت وغیرہ بھی معلوم کر لینا اور ناہید سے کہہ دینا کہ میں جلد ہی واپس آؤں گا۔ گلبدن سے کہہ دیں۔"

ساجد نے لکھا تھا کہ وہ لکھنؤ میں بیحد مصروف ہے لہٰذا کوسانی نہیں آ سکتا۔ (اس نے جان بوجھ کر اپنی حالت کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔) اس نے ناہید کو تسلی دی تھی کہ وہ گھبرائے نہیں اور چچا کے غم کو دل سے بھلانے کی کوشش کرے۔ پورا خط اسی قسم کی باتوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور ساجد نے جو آنسو خط لکھتے ہوئے کاغذ پر ٹپکائے تھے، اُن آنسوؤں میں اب ناہید کے اشک بھی گر کر شامل ہو گئے تھے۔ خط سینے سے بھینچ کر وہ بری طرح رو رہی تھی۔ جہاں اسے اپنے مشفق باپ کے چلے جانے کا رنج تھا وہاں ساجد کے مل جانے کی مسرت بھی تھی۔

ساجد نے وجہ کچھ نہیں لکھی تھی کہ آخر وہ کس کام سے لکھنؤ پہنچا تھا۔ اس نے بتا دیا تھا کہ محبوب اس کے ساتھ ہے اور وہ دونوں

کشور سے بھی مل چکے ہیں۔ کشور اُسے پاکر بہت خوش ہوئی ہے اور چند دنوں بعد ہی اُسے اپنے ماں باپ سے ملوائے گی۔

ناہید خط پڑھنے کے بعد بڑی دیر تک سکتے کے عالم میں بیٹھی رہی۔ اُس کی نظروں کے سامنے سُرمئی رنگ کی وہ پہاڑیاں تھیں جن کے بارے میں اُس نے ایک بار ساجد سے کہا تھا کہ ان کے پیچھے مسرت کی ایک جنت آباد ہے اور کسی ایسے مسافر کی راہ تک رہی ہے جو ایک دن چپکے سے وہاں آجائے گا۔

مسافر تو آیا تھا اور آکر چلا بھی گیا۔!

اور اب یہ جنت غم واندوہ کی دوزخ بن کر رہ گئی تھی۔ بادل اب بھی چوٹی پر لہرا رہے تھے اور ناہید کو یوں لگ رہا تھا کہ یہ بادل نہیں اس کی آہوں کا دھواں ہے جو بڑی سرعت سے اُس کے دل پر چھاتا جا رہا ہے۔ یخ بستہ ہوائیں اس کی ناکام محبت کی بربادی کا پیغام لے کر آرہی تھیں، خوبصورت پرندے اس کے سامنے آکر بیٹھ جاتے تھے — اور اپنی ننھی منّی سی اُداس آنکھوں سے اُسے پہروں تکتے رہتے تھے۔ فضا سوگوار تھی، پورا ماحول ماتم کرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اُس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا اور وہ زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے دل کی بربادی پر نوحہ خواں تھی۔ راز جب دل میں پناہ لیتے ہیں تو دل کی جلن بڑھ جاتی ہے اور اس جلن کا بڑھنا اچھا نہیں ہوتا۔!

ناہید کے حق میں بھی یہ بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوا —— اُسے چپ لگ گئی۔ وہ ایک ہی سمت میں ٹکٹکی لگائے پہروں دیکھتی رہتی۔ سوچتی رہتی اور روتی رہتی۔ اتنا روتی اتنا روتی کہ اپنے دامن میں شدید بارش چھپائے ہوئے بادل، شرمندہ ہو کر بغیر برسے اُس مقام سے گذر جاتے۔

وہ اشکبار تھی۔ مضطربانہ طریقہ پر بار بار رومال سے آنسو صاف

کر رہی تھی کہ اچانک زماں اس کے سامنے آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ناہید کو علم ہی نہ ہو سکا کہ وہ کب اندر داخل ہوا تھا ـــــ اصولاً زماں کو اجازت لینی چاہیئے تھی۔ لیکن جب زماں نے گھنٹی بجانے کے بعد کسی کو دروازہ کھولتے نہ سُنا تو مجبوراً وہ خود ہی دروازہ کھول کر اندر آگیا تھا اور اب ناہید کو تشویشناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے اُسے خاموشی سے دیکھنے کے بعد اُس نے کہا۔

"معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کو بارہا منع کیا ہے مگر آپ روئے جاتی ہیں ـــ۔"

ناہید خاموش رہی۔

"جو چلے جاتے ہیں، وہ پھر واپس نہیں آتے۔"

ناہید نے صرف گیلی پلکوں کی اوٹ سے اُسے دیکھا۔

"خدا کے لئے یوں اپنے دل کو روگ مت لگایئے۔ اس طرح کچھ ہو نہ جائے۔"

"مجھے کوئی فکر نہیں ہے زماں صاحب، مجھے اپنی زندگی سے ذرا سی بھی دلچسپی نہیں رہی ـــ۔" ناہید نے آہستہ سے جواب دیا۔

"آپ کی زندگی دوسروں کے لئے کتنی اہم ہے، یہ آپ نے کبھی سوچا؟"

"جب میرا اپنا گھر جل گیا ہو تو مجھے دوسروں کے نشیمن کی کیا فکر؟"

"سمجھ میں نہیں آتا میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں۔ آپ اِس تنہائی سے ضرور اُکتا جائیں گی۔ آپ کو کسی ساتھی کی ضرورت ہے۔"

"میں نے تسنیم کو خط لکھ کر بلایا ہے۔ وہ ایک دو روز میں آجائیگی۔"

ناہید کے اس جواب سے زماں پر گھڑوں پانی پھر گیا اور وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ یہ لڑکی کسی طرح شیشے میں نہیں اُتر سکتی۔ اُس کی تنہائی سے اب زماں کو بھی خوف آنے لگا تھا۔ کہیں یہ مر نہ جائے! اُس کے دل میں وسوسے پیدا ہونے۔ حق تو یہ ہے کہ طیش کے عالم میں اُس نے ساجد کے ساتھ جو حرکت کی تھی اب وہ اُس پر پشیماں تھا۔ غیض و غضب میں قوئ عقل کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور یہی زماں کے ساتھ ہوا تھا۔ اُس نے کبھی خواب میں بھی یہ نہ سوچا تھا کہ وہ ساجد کو اس طرح قتل کرے گا۔ بس عالم دیوانگی میں اس سے یہ حرکت سرزد ہو ہی گئی تھی۔ ساجد کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ اپنے آپ میں نہ رہا تھا اور اس سے وہ بدترین اقدام ہو گیا تھا جس کا اُسے ہمیشہ تاسف رہا اور اس کی روح پر لگا تار تازیانے برستے رہے۔ اب اُسے افسوس ہو رہا تھا کہ اگر ساجد یہاں ہوتا تو کم از کم ناہید تو خوش رہتی۔ اپنے دل میں بار بار جھانک کر دیکھنے کے بعد اُسے اب یہ احساس ہو چلا تھا کہ وہ ناہید سے والہانہ محبت کرتا ہے اور اُسے خوش و خرّم دیکھنا چاہتا ہے اور بس!

"آپ میری بات ہمیشہ غلط سمجھتی ہیں۔ میں اپنے بارے میں نہیں کہہ رہا ناہید صاحبہ۔ میں آپ کی نظروں میں کوئی اہمیت اور وقعت حاصل نہ کر سکا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں آپ کے بغیر جی نہیں سکتا۔ آپ ہی میری زندگی ہیں اور میں آپ کے لئے ہر لمحہ فکرمند رہتا ہوں۔"

ناہید چونک کر زماں کو دیکھنے لگی اور زماں نے بات جاری رکھی۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیئے، صرف آپ کی تمنّا ہے۔ آپ کو حاصل کرنے کی آس ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ پہلے پہل میں صرف آپ کی قربت کا متمنّی تھا، میری اُنسیت محض ایک ڈھونگ تھی، لیکن میرا خدا گواہ ہے کہ اب

ایسا نہیں ہے۔ میں آپ کو اپنے دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں۔ مجھ سے آپ کی یہ اداسی دیکھی نہیں جاتی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ہنسیں، قہقہے لگائیں۔ ہمیشہ خوش رہیں۔"

"خوشی میری قسمت میں ہے ہی کہاں؟" ناہید نے ٹھنڈی سانس بھر لی۔

"میں آپ کے قدموں میں پوری دنیا کی خوشیاں سمیٹ کر ڈال دونگا ناہید صاحبہ خدا کے لئے میرے لئے سوچیئے، دیکھئے ساجد کا کچھ اتہ پتہ نہیں۔ نہ جانے وہ کہاں چلا گیا۔۔۔ لیکن فرض کر لیجیے کہ وہ آپ کو مل بھی گیا تو کیا وہ آپ کا بن جائے گا؟۔۔۔ یہ بات صاف ذہن کے ساتھ سوچیئے۔ میں بخدا طنز نہیں کر رہا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ساجد نے آپ کو بہن کی طرح چاہا ہے۔ اگر اُسے یہ علم ہو گیا کہ آپ اُس کے لئے اپنے دل میں کچھ اور ہی جذبات رکھتی ہیں تو یقین جانیئے گا وہ یہاں نہیں رُکے گا۔ وہ آپ سے دُور چلا جائے گا۔"

"نہیں نہیں ۔۔۔ خدا کے لئے ایسی بات مت کہیئے ۔۔۔" ناہید بلک پڑی۔

"میں نے بغیر کسی لاگ لپیٹ کے یہ باتیں کہی ہیں۔ آپ ان پر تنہائی میں غور کیجئے گا۔"

ناہید بڑی دیر تک سوچتی رہی۔ اُس کے ہونٹوں کے کنارے کبھی کبھی لرزنے لگتے۔ آنکھیں ڈبڈبا آتیں تو وہ عینک رومال سے صاف کر لیتی۔ اُس کے دل میں طوفان اٹھ رہا تھا۔ اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر وہ کیا کرے۔ کہاں جائے، کس سے فریاد کرے۔!

مگر پھر جیسے اُس نے کوئی تہیہ کر لیا۔ وہ کسی خاص فیصلے پر پہنچ گئی۔

اب اس نے اپنی صراحی دار گردن اوپر کی اور زماں پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں بلا کا کرب تھا۔ ان تھکی تھکی سی نیم وا آنکھوں سے اس نے زماں کو دیکھا اور پھر بولی۔

"زماں صاحب!"

"جی ــــ؟"

"میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ نے خلوصِ دل سے بہت سی باتیں کہی ہیں ــــ"

"جی ہاں ــــ جی ہاں ــــ" زماں کی باچھیں کھل گئیں۔

"مجھے آپ کی نیت میں ذرا بھی شک نہیں ہے ــــ لیکن ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔"

"فرمایئے۔"

"آپ میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ لہٰذا یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں ساجد سے اپنی روح کی گہرائیوں کے ساتھ محبت کرتی ہوں، آپ میرے ساتھ اپنی زندگی گذار سکیں گے؟"

"کاش میں اپنا دل چیر کر دکھا سکتا ناہید صاحبہ ــــ سچ مانئے میں اسے اپنی خوش قسمتی تصور کروں گا۔" زماں نے خوش ہو کر اپنی کرسی ناہید کے قریب کھسکا لی۔

"سوچ لیجئے ــــ ایسا نہ ہو کہ بعد میں آپ مجھے ایک بوجھ سمجھنے لگیں ــــ؟"

"یہ بوجھ میرے لئے پھولوں کے برابر ہوگا اور میں اسے اپنی عزت افزائی سمجھوں گا۔"

"بس نور زماں صاحب۔ جو بات میں نے پہلے نہیں مانی تھی اب مان لیتی ہوں۔"

ناہید نے پرسکون آواز میں کہا۔ مگر اُسے خود اپنی آواز عجیب سی لگی۔ یوں لگا گویا کنوئیں میں سے صدائے بازگشت بن کر نکلی ہو۔

"ناہید صاحبہ ـــ شکریہ، بہت بہت شکریہ!" فرطِ مسرت سے زماں لرزنے لگا۔ اُس نے ناہید کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ـــ برف جیسے ٹھنڈے ہاتھ، جن میں زندگی کی ذرا سی بھی گرمی نہیں تھی۔

"مگر زماں صاحب ـــ!" ناہید نے بالکل کھوکھلی آواز میں کہا۔

"جی ـــ؟"

"اس کے لئے میری ایک شرط ہے۔"

"مجھے ہر شرط منظور ہے۔ ہر بات منظور ہے۔"

زماں کی بیقراری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

"یہ شرط پوری ہو جانے کے بعد آپ مجھے حاصل کر سکتے ہیں۔"

"فرمائیے ـــ فرمائیے۔"

اور پھر ناہید نے اپنے اضطراب کو چھپاتے ہوئے زماں کو وہ شرط سنادی۔ شرط ایسی تھی کہ زماں کو اپنی سماعت پر شبہ ہونے لگا ـــ اور حواس باختہ ہونے کے باوجود نہایت صبر و تحمل کے ساتھ اُس نے وہ شرط سن کر صرف اتنا کہا۔

"آپ نے مجھے بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا ہے ـــ لیکن میں آپکے حکم سے سرتابی نہیں کروں گا۔ جو آپ چاہتی ہیں وہی ہوگا۔"

۲۸

کوسانی جانے کی بجائے جب کشور واپس لکھنؤ پہنچ گئی تو گھر میں بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ فرزانہ کو ساجد بہت پسند آیا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنی بہن کی خوشی کی خاطر جھوٹ بول دیا کہ راستے میں آپا کی طبیعت کافی خراب ہو گئی تھی لہٰذا ان دونوں کو واپس آنا پڑا۔

لیکن یہ جھوٹ آخر کب تک چلتا۔ کسی نہ کسی دن تو بھانڈا پھوٹنا ہی جانا تھا۔ سب کو یہ حقیقت بھی معلوم ہو جانی تھی کہ کالج سے آنے کے بعد کشور اپنی جس سہیلی کے پاس جاتی ہے وہ کوئی اور نہیں ساجد ہے۔

چوری چھپے کی ان ملاقاتوں سے ساجد بھی عاجز آ گیا تھا۔ فرزانہ نے اُسے بتایا تھا کہ جب کبھی امّی اور ابّا کے سامنے اس کا ذکر کرتی ہے، وہ دونوں سختی سے اُسے اس ذکر سے باز رکھتے ہیں اور ہدایت کرتے ہیں کہ آئندہ کبھی بھولے سے بھی ساجد کا نام اس کی زبان پر نہ آئے۔

ساجد اس صورتِ حال سے بہت پریشان تھا۔ کشور بھی پہروں یہی سوچتی رہتی تھی کہ آخر اُس کی محبت کا انجام کیا ہوگا؟ وہ کس طرح اپنے والدین کے دل میں دل ڈالے گی۔؟ آبشار والے حادثے سے لے کر اُس دن تک تقریباً بارہ دن گذر چکے تھے۔ ساجد کو یہ احساس بھی کھائے جا رہا تھا کہ اُسے جلد سے جلد ناہید کے پاس جا کر اُس کی دلجوئی کرنی چاہیئے۔ وقت گذرا جا رہا تھا اور وہ ابھی تک کوسانی نہ جا سکا تھا۔!

محبوب سے جب یہ تذکرہ کیا گیا تو اس نے ایک سرد آہ بھرنے کے بعد جواب دیا۔

"تمہیں تو تمہاری محبوبہ مل گئی مگر کاش تم میرے دل میں جھانک کر دیکھتے۔؟"

"تمہیں کیا ہوا۔؟"

"میں گلبدن کے بغیر بالکل اُلّو کا پٹھا ہو کر رہ گیا ہوں ــــ کیوں ہو کر رہ گیا ہوں، یہ میں تمہیں فرصت میں بتلا سکتا ہوں۔"

"اس وقت مجھے فرصت ہی فرصت ہے ـــــ" ساجد نے مسکرا کر کہا۔

"میرے خرمنِ دل پر بجلی گر گئی ہے۔ میرا آشیانہ برباد ہو گیا ہے۔ میرے ارمانوں کا قافلہ لوٹ لیا گیا ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک لڑکی گلبدن کا کیا دھرا ہے۔" محبوب نے افسردگی کے ساتھ کہا۔

"تم کہو تو میں پولیس میں رپورٹ کر دوں۔"

"کیوں ــــ کس لیئے؟"

"گلبدن کی گرفتاری کے لیئے ــــ اُس نے تم پر بڑا ظلم

ڈھایا ہے۔"

"مذاق مت اُڑاؤ ساجد۔" محبوب نے منھ بنا لیا۔ "میں سچ کہتا ہوں کہ ان دنوں میں بہت پریشان ہوں ـــــ کیوں پریشان ہوں یہ میں تمہیں ....."

"سنو محبوب ـــ" ساجد نے اُسے درمیان ہی میں ٹوک دیا ـــ "بیکار کی باتوں میں ہمیں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ ذرا سنجیدگی سے سوچو کہ ناہید ان دنوں اکیلی ہوگی۔ چچا کے انتقال نے اُسے ادھ موا کر دیا ہوگا۔ ایسے نازک وقت میں وہ تسلی دینے والے کسی شخص کو اپنے قریب دیکھنے کی متمنّی ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ اب اس کے پاس چلا جائے۔ کشور کو بھی ساتھ لے لیں گے آخر وہ وہاں جا بھی رہی تھی، ہماری وجہ سے اُس نے اپنا یہ ارادہ ملتوی کیا تھا۔"

"تمہاری عقل اس لئے سلب ہوگئی ہے کہ اب عشق اُس پر مسلّط ہوگیا ہے۔" محبوب نے کہا ـــ "بندۂ خدا یہ تو سوچو کہ وہاں زماں بھی ہوگا۔"

"تو کیا میں اس سے ڈر کر یہیں بیٹھا رہوں۔ چوڑیاں پہن لوں! ـــ تم بھول گئے ہو محبوب کہ جتنا خیال مجھے کشور کا ہے اُس سے کہیں زیادہ ناہید کا ہے۔ میں راتوں کو خواب میں اُسے روتا اور بلکتا ہوا دیکھتا ہوں۔ میں ـــــ میں اب یہاں نہیں رُک سکتا۔"

ساجد نے اتنا ہی کہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی، محبوب نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ کشور دروازے میں کھڑی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے، آپ دونوں شاید تیز آواز میں باتیں کر رہے تھے؟" کشور نے شوخی سے کہا۔

"ہاں — یہ آپ کے ساجد صاحب اِس کمرے سے نکلنا چاہتے ہیں ۔"

"مگر ابھی تو آپ پوری طرح صحت مند بھی نہیں ہوئے ؟" کِشور تشویشناک لہجے میں بولی

"مجھے ناہید کی بہت فکر ہے کشور — نہ جانے اُس پر کیا بیت رہی ہو گی ۔"

"ہاں، مجھے اس کا احساس ہے۔ آپ کے ساتھ میں بھی چلوں گی لیکن پہلے میں آپکو ایک بُری خبر سُنانا چاہتی ہوں —" کِشور نے تفکّر آمیز انداز میں گردن جھکا لی۔

"کیا بات ہے — ؟" ساجد مضطرب ہو گیا۔ اُس کا خیال ناہید کی طرف گیا، خدانخواستہ اُسے کچھ ہو نہ گیا ہو۔!

"شاید ابّا کو ہماری ملاقاتوں کا علم ہو گیا ہے —" کِشور نے بے چین ہو کر کہا ۔" انھوں نے کل رات مجھے اپنے پاس بُلا کر خلافِ توقع ایک عجیب بات کہی ۔"

"کیا کہا انھوں نے ؟"

"اُنھیں علم ہو گیا ہے کہ آپ یہاں اِس ہوٹل میں موجود ہیں اور میں آپ سے روزانہ یہاں ملا کرتی ہوں ۔" کشور اتنا کہہ کر کرسی پر بیٹھ گئی، اور اپنے ہاتھ ملتے ہوئے بولی ۔" انھوں نے بیشک مجھ سے یہ نہیں کہا کہ میں آئندہ آپ سے نہ ملوں، لیکن یہ ضرور کہا کہ مجھے اس طرح کسی غیر شخص کے پاس نہیں جانا چاہیئے۔ لوگ کیا کہیں گے ۔"

"لوگوں کا کام کہنا ہی ہے —" محبوب نے گردن جھٹک کر کہا —

"کہنے دیجئے۔ ساجد نے کوئی گناہ یا جرم نہیں کیا ہے ــــ کیوں نہیں کیا ہے یہ میں آپکو پھر......"

"مجھے اس پر بڑی حیرت ہے ساجد۔ ابّا نے ایک بات اور کہی ہے۔" کشور نے محبوب کی بکواس پر توجہ نہ دیتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا ہے انھوں نے ؟"

"انھوں نے آپکو گھر بلایا ہے۔"

"کیا ــــ ؟" ساجد نے گھبرا کر اُسے دیکھا۔

"ہاں، وہ کہنے لگے کہ اُس شخص کو گھر لے کر آؤ۔ میں اُس سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"مر گئے یار ــــ اب تو بالکل ہی مر گئے ــــ" محبوب کے دیوتا بھی کوچ کر گئے۔

"میں آپکو لینے آئی ہوں۔"

کِشور کی یہ بات سُن کر ساجد کو سکتہ ہو گیا۔ چند لمحے تک وہ خاموش رہا۔ محبوب منھ بنائے ہوئے زمین کو تک رہا تھا۔

"کیا چلیں گے آپ ؟" کشور نے پھر پوچھا۔

ساجد کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر کشور کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

"ضرور چلوں گا کشور ــــ میں ڈرپوک نہیں ہوں۔ میں تمہارے والد سے کہہ دوں گا کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ میرا دامن گناہ کی آلودگیوں سے پاک ہے۔ میں تمھیں پسند کرتا ہوں اور تم سے اپنی زندگی وابستہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"بہت خوب، بہت اچھے مکالمے ہیں۔" محبوب نے جھک کر کہا۔
"بس شرط یہ ہے کہ یہ مکالمے موقع پر ادا ہو جائیں۔"

ساجد نے جو تصویر کشور کے والد کی اپنے تخیل سے بنائی تھی۔ خان بہادر اشرف اس سے مشابہ نہیں تھے۔ وہ دبلے پتلے، منکسر المزاج اور بے حد حلیم و بردبار شخص تھے۔ اپنے عالیشان ڈرائنگ روم میں وہ ایک صوفے پر دراز تھے اور ناقدانہ نظروں سے ساجد کو جانچ رہے تھے۔
"تمہارے والدین ہیں۔؟" جسم کے مقابلے میں اُن کی آواز بہت بھاری تھی۔
"جی نہیں —"
"میری لڑکی کو کب سے جانتے ہو؟" بڑا عجیب سوال تھا۔
"جی در اصل اُن سے اسکیٹنگ ہال میں ملاقات ہوئی تھی۔" ساجد نے رومال سے پسینہ پونچھ لیا۔
"پھر — ؟"
"مجھے اعتراف ہے جناب کہ اُس ملاقات کے بعد میں — میں —"
وہ چپ ہو گیا۔
"تم اسے پسند کرنے لگے — یہی نا؟"
"جی —"
"لیکن تم نے یہ بھی سوچا تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟" انھوں نے سگار کا ڈبہ اُٹھا کر ساجد کو پیش کیا اور اُس کے انکار پر ایک سگار نکال کر منھ میں دبا لیا۔

"جی یہ میں نے اس وقت نہیں سوچا تھا۔" ساجد تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

"کیوں نہیں سوچا۔" خان بہادر کا لہجہ تیز ہو گیا۔ "تم نوجوانوں میں یہی تو خامی ہوتی ہے۔ پہلے لڑکیوں سے الفت جتاتے ہو اور پھر یہ سوچتے ہی نہیں کہ یہ الفت کیا رنگ لائے گی۔؟"

ساجد خاموش رہا۔ کچھ نہیں بولا۔

"کیا تمہیں اس بات پر شرمندگی نہیں ہوتی کہ تم میری پیاری بیٹی سے چھپ چھپ کر ملتے رہے ہو۔۔۔ کیا تمہیں اس کا ذرا بھی احساس نہ ہوا کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو گیا تو خان بہادر اشرف کی عزّت دو کوڑی کی رہ جائے گی۔ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے۔"

"مجھے احساس تھا لیکن یقین مانئے میری نیت بُری نہیں ہے۔" ساجد بے چینی محسوس کر رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہاں سے اُٹھ کر بھاگ جائے۔

"سب یہی کہتے ہیں۔ تم نے کونسا تیر مار لیا یہ کہہ کر۔"

خان بہادر کے اتنا کہتے ہی ساجد کا خون کھول گیا۔ اس کی محبت کی توہین ہو رہی تھی اور وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ حتی الامکان اس نے اپنی آواز دبا کر کہا۔

"گستاخی معاف جناب۔۔۔ لیکن میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ کیا ہوا جو میں آج غریب ہوں لیکن میں ایک باعزت خاندان کا فرد ہوں۔ میں ایسی نیچ بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے کشور سے جو محبت کی ہے وہ عارضی نہیں ہے۔ میں اس محبت کو شادی میں بدل دینے کا خواہشمند ہوں۔ وہ خود بھی یہی چاہتی ہیں۔ کسی لڑکی سے شادی کرنا کوئی بری بات نہیں ہے۔

دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔"

"واہ وا ـــــ خوب، میاں آپ تو ماشاء اللہ بہت اچھا بول لیتے ہیں۔"
خان بہادر نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں کہا۔" آپ کو اپنے منھ سے اپنی ہی شادی کا ذکر کرنا کیا معیوب نہیں لگتا ؟"

"بیشک آپ کا فرمانا درست ہے۔" ساجد نے سر جُھکا لیا۔" لیکن میرا دنیا میں اب ناہید کے سوا کوئی نہیں ہے اور وہ بھی ان دنوں اپنے غم میں مبتلا ہے۔"

"ناہید کون ـــــ ؟" خان بہادر نے چونک کر کہا۔

"میری بہن ـــــ میرے چچا کی لڑکی ـــــ چند دن ہوئے میرے بزرگ چچا کا انتقال ہوا ہے۔ اگر وہ ہوتے تو یقین مانیئے وہی آپکی خدمت میں اس سلسلہ جُنبانی کے لئے حاضر ہوتے ـــــ"

ساجد نے گلو گیر آواز میں کہا۔ نجمی صاحب کا خیال آتے ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

خان بہادر اشرف اُسے کنکھیوں سے دیکھتے رہے اور پھر فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

"خیر مجھے اس سے غرض نہیں۔ میں اب تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں ـــــ"

"جی ـــــ"

"میری بڑی بدنامی ہو چکی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پورے شہر کی زبان پر میرے ہی گھر کی کہانی ہو۔ اس لئے آج سے تمہارا اور کشور کا ملنا جلنا بالکل بند۔"

"مگر ـــــ مگر میں آپ سے گذارش کروں گا کہ ـــــ"

"بس صاحبزادے بس ــــ" خان بہادر نے ہاتھ کا اشارہ کرکے اُسے چپ کر دیا۔"میں اپنے فیصلے بدلنے کا عادی نہیں ہوں۔ آج سے تم کشور سے نہیں مل سکو گے۔"

"بہتر ہے ــــ" ساجد دل مسوس کر رہ گیا۔

"پوچھو کیوں ــــ کیوں نہ مل سکو گے؟" خان بہادر کی نگاہیں چمک اُٹھیں ــــ

"جی نہیں ــــ میں جانتا ہوں کہ میری قسمت کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔" ساجد نے مضمحل انداز میں جواب دیا۔

"نہیں، تم یہ ضرور پوچھو کہ کیوں نہیں مل سکو گے۔" خان بہادر نے پھر وہی سوال کیا۔

"فرمائیے ـ کیوں نہ مل سکوں گا۔؟"

"اس لئے کہ آج سے اُسے مایوں بٹھا دیا جائے گا ــ" خان بہادر مسکرائے۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"تم اسی لئے اس سے نہیں مل سکو گے کہ شادی سے پہلے اپنی ہونے والی بیوی سے ملنا ہمارے معاشرے میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔" خان اشرف نے ہنس کر کہا۔

"یہ ــــ یہ ـــ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" ساجد حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اُنھیں دیکھنے لگا۔

"ہاں میاں، تم مجھے پسند ہو اور میں اپنی لڑکی کی شادی اسی ہفتے میں تم سے کر دینا چاہتا ہوں ــــ کہو اب تو خوش ہو؟"

ساجد بے تابی سے اُٹھا اور خان صاحب کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ فرطِ مسرت سے اس کے لب کپکپا رہے تھے۔ اُس نے بیقراری سے کہا۔

"میں ___ میں آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ آپ مجھے ہمیشہ اپنا خادم پائیں گے۔"

"جیتے رہو۔ جیتے رہو ___" خان بہادر نے اُٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

۲۹

اور تب اسے معلوم ہوا کہ اُس کا بھی خدا ہے۔ وہ دیر تک آسمان کی رفعتوں میں نظریں گاڑے اپنے معبود کا شکریہ ادا کرتا رہا اور گڑگڑاتا رہا۔ خان صاحب نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنی بہن کو بلوائے تاکہ شادی کے تمام کام انجام پائیں۔ اس مقصد کے لئے اس نے محبوب کو کوسانی بھیج دیا ___ خان بہادر نہیں چاہتے تھے کہ وہ خود جائے۔ اتنے اچھے اور معقول داماد کو وہ اب اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتے دیتے تھے۔ مجبوراً ساجد نے محبوب کو بھیجا اور ہدایت کر دی کہ وہ ناہید کو اپنے ساتھ ہی لے کر آئے۔

محبوب راستے بھر یہی سوچتا رہا کہ اگر کوسانی میں اس کی ملاقات زماں سے ہو گئی تو اُس کا برتاؤ اس سے کیسا ہونا چاہیئے۔ اپنے انتقامی جذبے کو وہ بھلا دل سے کس طرح دُور کر دے گا۔ اُس کے سامنے ہی زماں نے ساجد کو

قتل کرنے کی کوشش کی تھی ! اپنے ارادے کو، اِس سے پہلے کہ وہ دل میں جڑ پکڑ جائے، اُس نے فوراً ذہن سے دُور کر دیا۔ ساجد اب اُسی خاندان کا ایک فرد بننے والا تھا جسکا نعمان تھا۔ لہٰذا اب نعمان کو کچھ کہنا یا اُس سے انتقام لینا مصلحت کے خلاف تھا !

نجمی صاحب کے خوبصورت بنگلے پر اب اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا گویا کوئی اس کی دلکشی اور حسن کو چرا کر لے گیا ہو۔ اس سے زیادہ بدتر حالت ناہید کی تھی۔ محبوب نے جب اُسے دیکھا تو دھک سے رہ گیا ــــــ یہ ناہید ہے ؟ اگر یہ وہی ہے تو پھر وہ چنچل اور شوخ ناہید کہاں گئی۔ ؟

اس کے گالوں کے سیب مرجھا گئے تھے۔ آنکھیں ویران اور تھکی تھکی سی تھیں۔ چہرے کی شگفتگی مفقود تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے، اور آواز بیحد کمزور سی تھی۔

نہیں ــــ یہ ناہید نہیں ہو سکتی۔ !

اور پھر محبوب کو یقین کرنا ہی پڑا۔ اس لئے یقین کرنا پڑا کہ نجمی صاحب اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ ناہید ان کے غم میں سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ ایک بیٹی سے اُس کا مشفق باپ جُدا ہو جائے تو کیا اس کی اس سے بھی بدتر حالت نہیں ہو گی ؟

ناہید اسے دیکھ کر مسکرائی۔ بڑی مضمحل سی مسکراہٹ۔

"مجھے بہت افسوس ہے ناہید صاحبہ۔" محبوب نے گویا نجمی صاحب کے سلسلے میں تعزیت کا اظہار کیا ــــ "بڑی دردناک موت تھی نجمی صاحب کی۔"

"ہاں محبوب صاحب۔ سبھی لوگ دنیا میں زندہ تھوڑی ہی رہتے ہیں۔" ناہید نے اداس لہجے میں کہا۔

"نجمی صاحب کا زیادہ ذکر کر کے میں آپ کا دل نہیں دکھانا چاہتا۔ میں تو یہاں ایک خاص مقصد کے لئے حاضر ہوا تھا۔ کیوں حاضر ہوا تھا، یہ میں آپ کو پھر کبھی بتلاؤں گا۔"

محبوب نے اتنا ہی کہا تھا کہ اندر سے تسنیم ایک گلاس میں اورنج جوس لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ محبوب کو دیکھ کر پہلے تو چونکی۔ اور پھر گلاس ناہید کی طرف بڑھا دیا۔

"نہیں تسنیم خواہش نہیں ہے، محبوب صاحب کو دو۔"

"میں اور لے کر آتی ہوں — میرا کہنا نہ مان کر تو تم نے یہ حالت کر لی ہے —" تسنیم اتنا کہہ کر اٹھ گئی۔ محبوب اُسے کمرے سے باہر جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

"آپ لوگ اچھے ہیں نا؟" پورے جسم کا درد سمٹ کر ناہید کی آواز میں آگیا۔

"ہاں — ٹھیک ہی ہیں۔"

"ساجد صاحب کو اتنا بھی وقت نہیں ملا کہ یہاں آکر ابّا کے جنازے میں شریک ہوتے۔"

ناہید نے جو شکوہ کیا تھا، محبوب پہلے ہی سے جانتا تھا کہ یہ شکوہ کرنے میں وہ حق بجانب ہے۔ پھر بھی وہ سوچ کر آیا تھا کہ ناہید کو اس کا جواب دے گا۔

"آپ ساجد کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم مت کریں۔ دراصل وہ مجبور تھا۔"

"مجبور تھے — کیوں؟"

محبوب نے سوچا اگر اُس نے ٹھیک بات نہیں بتائی تو ساجد پر حرف آتا ہے۔ ناہید یقیناً آشنا کی ہے۔ چنانچہ چند باتیں بتا دینے میں کوئی حرج نہیں۔

"وہ اس لئے مجبور تھا کہ در اصل وہ ایک حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔

کیوں ہو گیا تھا؟۔ یہ میں ....."

"کیا۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔؟" ناہید کی آنکھیں خوفزدہ انداز میں پھیل گئیں۔

"جی ہاں ـــ وہ ایک کھڈ میں گر گیا تھا۔" محبوب نے دانستہ جھوٹ بولا۔

"کہاں ـــ کب ـــ مجھے کیوں اطلاع نہیں دی۔؟" ناہید بے چین ہو گئی۔

اِس عرصے میں تسنیم جوس کا دوسرا گلاس بنا کر لے آئی تھی اور وہ گلاس اُس نے ناہید کو دے دیا۔ محبوب نے بڑھا چڑھا کر وہ داستان سنائی۔ کس طرح ساجد آبشار کے قریب گیا اور پھر کیسے اُس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے آبشار کے دامن میں گر گیا۔ یہ سُن کر ناہید کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک جاتا رہا۔

محبوب نے عقلمندی کی کہ اُس نے یہ نہیں بتایا کہ زماں اقدام قتل کا مرتکب ہوا تھا۔ لیکن اتنا سنتے ہی ناہید کی حالت غیر ہو گئی۔ یوں لگا گویا کسی نے اس کا پورا خون نچوڑ لیا ہے۔

"لیکن آپ کو چاہیئے تھا کہ اُنھیں اتنی دُور لے جانے کی بجائے یہاں لے کر آجاتے۔"

"ساجد کو زخمی حالت میں اتنی بلندی پر لانا میرے لئے مشکل تھا ناہید صاحبہ۔ اور پھر اس طرح بہت دیر ہو جاتی۔ اتفاق سے اُسی وقت مجھے ایک جیپ مل گئی تھی اور میں اسے شہر لے گیا۔ کیوں لے گیا۔ یہ میں آپ کو پھر......"

"آپ نے یہ اچھا کیا ـــــ لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ سُن کر اب مجھے کتنی تکلیف ہوئی ہے۔ تم نے بھی سُنا تسنیم ـ ؟"

تسنیم چونکہ پوری بات نہیں سُن پائی تھی چنانچہ اُسے بھی سب کچھ بتانا پڑا۔ اُس نے پوچھا۔

"اُن کے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی ؟"

"ہاں زیادہ نہیں آئی۔ اتفاق سے وہ پتھروں سے نہیں ٹکرایا۔ پھسلتا ہوا نیچے آگیا تھا ـــ" محبوب نے کہا ـــ" اس لئے ناہید صاحبہ آپ اپنے دل سے یہ بات نکال دیں کہ ساجد جان بوجھ کر آپ کے پاس نہیں آیا۔ وہ تو آنے کے لئے تیار تھا مگر خان صاحب نے اُسے روک کر مجھے یہاں بھیجا ہے ـــ کیوں بھیجا ہے، یہ میں آپ کو پھر بتلاؤں گا۔"

"کون خان صاحب ـــ ؟" تسنیم نے چونک کر دریافت کیا۔

"کِشور کے والد صاحب ـــ" محبوب نے جواب دیا۔" آپ نے خط میں پڑھ ہی لیا ہوگا سب کچھ ـــ"

"ہاں مجھے علم ہے کہ کِشور انھیں مل گئی ہیں ـــ" ناہید نے طویل ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اور اس پر تسنیم نے اُسے گھور کر دیکھا ـــ اور پھر محبوب سے پوچھا۔

"کِشور ـــــ تو کیا اِن دنوں وہ کِشور کے گھر میں مقیم ہیں ـ ؟"

"پہلے تو ہوٹل میں تھا، مگر اب وہیں ہے ـــ کیوں ہے، یہ

میں آپ کو....."

"ناہید ــ میں پوچھتی ہوں آخر تم یہ کون سا کھیل کھیل رہی ہو؟" تسنیم نے فہمائشی انداز میں اس سے کہا۔

"سب ٹھیک ہے تسنیم سب ٹھیک ہے ــ تمہیں کچھ معلوم نہیں ــ" ناہید نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ "ہاں آپ نے یہ نہیں بتایا کہ خاں صاحب نے آپکو کیوں میرے پاس بھیجا ہے؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ خاں صاحب نے ساجد کو اپنا داماد بنانا منظور کر لیا ہے۔ اور اب ساجد نے آپ کو بلایا ہے تاکہ شادی کے انتظام آپ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔"

ناہید کسی اندرونی تکلیف کے باعث مضطرب ہو گئی۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ تسنیم گھبرا گئی اور اُسے جھنجھوڑتی ہوئی بولی۔

"ناہید ــ ناہید ــ کیا ہوا انہیں؟"

"کچھ نہیں ــ میں ٹھیک ہوں ــ بے پناہ مسرت اب میرا دل برداشت نہیں کرتا۔"

اتنا کہہ کر اس نے آنکھوں کے گوشے پونچھ لئے اور عینک اُتار کر شیشے صاف کر کے دوبارہ لگالی۔

"لیکن ناہید ــ اب تو آخری بار سُن لے۔ میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتی۔ میں اب کچھ نہیں چھپا سکتی۔ میں ایک ایک بات بتا دوں گی ــ سنئے محبوب صاحب۔ میں آپ کو یہ راز بتانا چاہتی ہوں کہ دراصل ناہید....."

"تسنیم ــ!" ناہید اس طرح حلق پھاڑ کر چلاّئی کہ تسنیم ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ ناہید کا رواں رواں لرز رہا تھا۔ آنکھوں میں ہزاروں شکوے

منور تھے۔ تسنیم کو ڈانٹنے کے بعد اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور پھر اُس نے تسنیم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت سے تھپتھپایا۔

"جن پودوں کو مرجھانا ہے مرجھا کے رہیں گے تو اُن میں آبِ حیات کیوں ڈال رہی ہے۔ اِس سے کچھ نہ ہوگا۔ کچھ بھی نہ ہوگا۔"

محبوب حیرت سے تسنیم کی باتیں سُن رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ معاملہ کیا ہے۔ اور پھر اس سے پہلے کہ اُسے سوچنے یا زیادہ غور کرنے کا وقت ملتا، ناہید نے اُس سے کہا۔

"میں ضرور آؤں گی محبوب صاحب — ظاہر ہے کہ ساجد صاحب کی شادی کا انتظام میں نہیں کروں گی تو پھر کون کرے گا —؟"

"لیکن یہ شادی کچھ دنوں کے لئے ملتوی نہیں ہو سکتی —؟" تسنیم نے کہا۔ "ابھی تو چچا جی کی قبر کے پھول بھی نہیں سوکھے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ دنیا میں ایسا تو روز ہی ہوتا ہے۔" ناہید نے پژمردہ آواز میں کہا۔ "شادیاں بھی ہوتی ہیں، جنازے بھی اُٹھتے ہیں۔ کب ہے شادی۔؟"

"اسی اتوار کو۔" محبوب نے آہستہ سے کہا۔

"میں ضرور آؤں گی۔ لازمی آؤں گی —" کپکپاتے ہوئے لبوں پر قابو پاکر اُس نے اپنے بیگ میں سے چیک بُک نکالی اور پھر ایک چیک بھر کر محبوب کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ — یہ کیا ہے۔؟"

"پچاس ہزار روپے کا چیک ہے۔ آپ اِس سے زیور وغیرہ بنوائیے اور دوسرے کاموں میں خرچ کیجئے۔ جب میں آؤں گی تو دوسرے اخراجات

سبھی کر لیے جائیں گے۔"

"مگر ۔۔۔ مگر شاید ساجد اسے پسند نہیں کرے گا؟"، محبوب نے پس و پیش کیا۔

"یہ تب دیکھا جائے گا۔ فی الحال جو میں کہہ رہی ہوں وہ کیجئے ۔۔۔ میں انشاء اللہ ایک دو روز میں پہنچ جاؤں گی۔"

ناہید شدید کمزوری محسوس کر رہی تھی جبھی اُس نے مضمحل انداز میں کرسی کی پُشت سے اپنی کمر لگا لی تھی۔

"بہتر ہے ۔۔۔ پھر میں جاتا ہوں ۔۔۔" محبوب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اور ہاں ۔۔۔"، ناہید نے مسکرا کر کہا۔" گلبدن مختلف بہانوں سے یہاں بار بار آ چکی ہے ۔۔۔ کیوں آ چکی ہے؟ یہ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں آپ جانتے ہی ہوں گے۔ جانے سے پہلے اس سے ضرور مل لیجئے گا۔"

محبوب نے شرما کر گردن جھکا لی۔ پھر ایک نظر اُس نے ناہید کو دیکھا اور جلدی سے دروازے سے باہر چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد رُکا ہوا سیلِ اشک، ناہید کی آنکھوں سے جاری ہو گیا۔ آواز پیدا نہ ہو اس لئے اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور ہچکیاں لینے لگی۔

"تم زہر کیوں نہیں کھا لیتیں ۔۔۔ اس طرح گھُٹ گھُٹ کر مرنے سے کیا فائدہ ہے؟"، تسنیم نے ایسے لہجے میں جس میں ناراضی سے زیادہ پیار چھپا ہوا تھا کہا۔

ناہید اُسی طرح روتی رہی۔

"اگر تمہیں اپنی جان عزیز نہیں ہے تو نہ سہی، مگر تم میری عزیز سہیلی ہو اور میں تمہاری یہ حالت نہیں دیکھ سکتی۔ سن رہی ہو میں کیا کہہ رہی

ہوں ۔ میں تمام خطوط آج ہی پوسٹ کردیتی ہوں ۔"

"تسنیم ۔" ناہید نے احتجاجاً کہا۔ "تجھے خدا کا واسطہ۔ تُو کس قسم کی باتیں کرنے لگی ہے ۔"

"پھر کیا کروں ــــ کیا تجھے روتا دیکھنے کے لئے ہی میں یہاں آئی ہوں !"

"اچھا میں اب نہیں روؤں گی بس ــــ ؟" ناہید نے آنسو پونچھ لئے ــــ

" تُو نے خود کو اتنا فریب دیا ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے ۔ اب یہ اکیلی پہاڑ سی زندگی کس طرح گذارے گی ؟"

"گذر ہی جائے گی کسی نہ کسی طرح ــــ" اُس نے آہ بھر کر کہا۔ "زماں صاحب سے میں نے شادی کی حامی بھر لی ہے ــــ تجھے تو معلوم ہے پھر بھی انجان بن کر پوچھتی ہے ۔"

"میں جانتی ہو ، مگر یہ شادی نہیں تیری بربادی ہوگی ۔"

"جو جس کے مقدر میں ہوتا ہے وہی اُسے ملتا ہے ۔"

ناہید نے آنکھیں بند کر لیں ۔ اُس کی صورت پر مردنی چھا گئی تھی اور تسنیم اُسے محبت اور غیض کے ملے جلے انداز میں گھورنے لگی ــــ

۳۰

آخر وہ دن بھی آگیا جس کا ساجد اور کشور کو بیچینی سے انتظار تھا۔ خان بہادر صاحب کے دوسرے گھر میں ساجد کو دولہا بننا تھا اور کشور پہلے گھر میں دلہن بنی بیٹھی تھی۔ ساجد نے ہر ہر قدم پر ناہید کی ضرورت محسوس کی تھی مگر وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اُس نے جتنے بھی تار بھیجے ہر ایک کا جواب یہی آیا کہ وہ آرہی ہے۔ خان صاحب بھی حیرت زدہ تھے کہ ایک ہی بہن اور وہ بھی شادی میں شرکت نہ کرے۔؟

ساجد کو اب اس حقیقت کا شدّت سے احساس ہوا کہ شاید وہ ناراض ہے۔ وہ اب شادی کو پسِ پشت ڈال کر کوسانی جانا چاہتا تھا۔ اپنی روٹھی ہوئی بہن کو منانا چاہتا تھا۔ اس کو بتلانا چاہتا تھا کہ شادی میں یہ جلدی خان بہادر کی طرف سے ہی ہوئی ہے۔ ورنہ وہ تو انتظار کر سکتا تھا۔

شادی سے ایک دن پہلے زاں بھی اپنے کاموں کو ادھورا چھوڑ کر

لکھنؤ آچکا تھا۔ اور آتے ہی اس نے یہ بتایا تھا کہ ناہید کی طبیعت خراب ہوگئی تھی تھی اس لئے پہلے نہیں آسکی۔

"کیا ہوا اُسے ۔۔۔؟" ساجد کو تشویش ہونے لگی۔

"غالباً موسمی بخار ہے۔ میں تو انھیں ساتھ ہی لے آتا مگر وہ راضی نہیں ہوئیں۔"

"کیوں راضی نہیں ہوئی ۔۔؟"

"کہتی تھیں کہ بیماری کی حالت میں وہ کاموں میں کیا دلچسپی لے سکیں گی۔"

"اوہ ۔۔!"

"لیکن جب میں چلا ہوں تو اُن کی حالت بہتر تھی۔ میرے سامنے انھوں نے اسباب بندھوانا شروع کردیا تھا، مجھے یقین ہے کہ وہ کل ضرور آجائیں گی۔"

"لیکن ــــ لیکن میں تو سوچ رہا تھا کہ میں خود اُسے لینے جاؤں۔" ساجد نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے انھوں نے کہہ دیا تھا کہ میں تمہیں اس اقدام سے باز رکھوں۔"

"اچھا ــــ جیسی ناہید کی مرضی ــــ" وہ چپ ہوگیا۔

"ساجد تم نے مجھ سے یہ دریافت نہیں کیا کہ آخر میں، جو اِس شادی کا سخت مخالف تھا، کس طرح اس میں شریک ہونے آگیا ہوں۔ اور آخر میں نے کیسے گوارا کرلیا ہے کہ جس بہن سے میں تمہارے ملنے تک کا روادار نہیں تھا، اب کیوں اس کا دامن تمہارے دامن سے باندھ رہا ہوں۔؟"

"میں آپ سے پوچھنا ضرور چاہتا تھا ــــ" ساجد نے اُسے کنکھیوں سے دیکھا۔

(خاکِ تمنا)

"سنو ساجد ــــ اصل میں مجھ سے ایک بہت بڑا جرم سرزد ہوا ہے۔ ایسا جرم جس سے تم ابھی تک ناواقف ہو۔ میں اپنے اس جرم کو بیان کرکے درحقیقت اپنے گناہوں کا کفّارہ ادا کر رہا ہوں۔"

"میں ــــ میں سمجھا نہیں۔"

"مجھے تم سے سخت نفرت تھی ساجد۔ اتنی نفرت کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ میں سمجھتا تھا کہ تم میری بہن کو ورغلا کر دُور چلے جاؤ گے۔ وہ زندگی بھر تڑپتی رہے گی اور تم آج کل کے نوجوانوں کی طرح اُس سے عشق کا ڈھونگ رچا کر اُسے برباد کردو گے۔ میں اسی لئے تم کو ناپسند کرتا تھا اور مجھے تم سے اتنی کدورت تھی کہ آخر ایک دن میں نے فیصلہ کرلیا۔ جس کی یاد آج تک میرے دل کو کھرچنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔"

"میں جانتا ہوں کہ آپ نے میرے ساتھ کیا کیا تھا۔ لیکن اب اُن باتوں کو بھول جائیے۔"

"کیسے بھول جاؤں، جب تک میں اپنی زبان سے اُس جرم کا اقرار نہ کرلوں گا، مجھے سکون نہیں ملے گا ساجد۔" زماں نے اُس سے نظریں چراتے ہوئے کہا ــــ "تم ایک دن پہاڑی راستے پر آئے اور میں نے وہاں تمہیں دیکھا۔ میں سڑک درست کرارہا تھا۔"

"اور آپ نے مجھے دیکھ کر آہنی کرین سے نیچے کھڈ میں گرادیا ــــ یہی نا؟"

"تم جانتے ہو ــــ تم سب جانتے ہو؟" زماں نے پشیمانی سے کہا۔ "اس پر بھی تم اب تک چپ رہے۔"

"ہاں، میں چپ رہا۔ میں نے کسی سے بھی یہ بات نہیں کہی ہے۔ محبوب

نے مجھے بچایا تھا اور صرف وہی یہ راز جانتا ہے۔"

"تم اتنے اعلیٰ ظرف انسان ہو ساجد ــــ یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے۔" زماں نے گردن جھکا کر کہا۔ "اب میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ تم مجھے معاف کر دو۔"

"میں نے معاف کر دیا زماں صاحب۔ یقین مانئے یہ راز میں کسی سے بھی نہیں کہوں گا۔"

"ناہید سے بھی نہیں ــــ ؟"

"ہاں ناہید سے بھی نہیں ــــ" ساجد نے اقرار کیا۔

"بس، اب میرے دل پر سے بوجھ اُتر گیا۔ جانتے ہو میں کیوں یہ چاہتا ہوں کہ ناہید کو یہ بات معلوم نہ ہو؟"

"اُسے دکھ ہوگا!"

"دُکھ تو ہوگا ہی، لیکن ایک بات اور بھی ہے۔"

"کیا ــــ ؟"

"بڑی منّت سماجت کے بعد اب وہ راضی ہوئی ہیں۔ اُنھوں نے مجھ سے شادی کا وعدہ کر لیا ہے۔"

"کیا سچ ؟" ساجد کو یہ سُن کر اتنی خوشی ہوئی گویا اُسے دولت مل گئی ہو۔

"ہاں ــــ اور اب میں تم سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ صرف تم ہی یہ کام کر سکتے ہو۔ میں یہ چاہتا ہوں ساجد کہ اسی ماہ میں بلکہ اسی ہفتے میں تم میرے سر پر بھی سہرا بندھوا دو۔!!"

"واہ ــــ خوب، یعنی میں سہرا بندھا دوں!" ساجد نے قہقہہ

لگایا۔

"ہاں ــ کیونکہ اُس شادی کا انتظام تمہارے ہی ہاتھ میں ہوگا ــ نجمی صاحب کے بعد تم ہی گھر کے بڑے ہو۔"

ساجد ہنسنے لگا اور زماں نے آگے بڑھ کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ آج پہلی بار وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آئے تھے۔!

شادی کا دن بھی آگیا۔ پورا علاقہ سجا دیا گیا۔ شہنائیاں بج اُٹھیں، اور ہر طرف مسرت و نور کی بارش ہونے لگی۔ شہر کے سربرآوردہ لوگ آئے، کشور کی سہیلیاں آئیں۔ سرکاری افسر اور وزرار آئے مگر نہیں آئی تو ناہید!

اُس کا بہتیرا انتظار کیا گیا۔ بار بار لوگ اسٹیشن گئے مگر اُسے آنا تھا نہ آئی۔ ساجد کا منھ لٹک گیا۔ غالباً وہ شادی سے انکار کر دینے کی سوچ رہا تھا کہ خان بہادر صاحب نے اُسے دلاسا دیا، اُسے بتایا کہ گاڑیاں لیٹ بھی ہو سکتی ہیں۔ اگر ناہید نہیں آئی تو تم لوگ شادی کے فوراً بعد وہاں جا سکتے ہو۔ ساجد دل مسوس کر رہ گیا ــ کر بھی کیا سکتا تھا۔

شادی کی ساعت قریب آگئی۔ قاضی صاحب تشریف لائے ــ ایجاب و قبول بھی ہو گیا لیکن ساجد کی نظریں ناہید کو ڈھونڈتی رہیں۔ مگر وہ اب بھی نہیں آئی۔؟

براتی چلے گئے، لوگوں نے مبارکباد بھی دے دی۔ جو گھر پہلے مہمانوں سے پُر تھا وہ اب خالی ہو گیا ــ بہت سے لوگ آئے اور بہت سے چلے

گئے ۔۔۔ مگر ناہید ۔۔۔ ! ناہید کا کہیں پتہ نہیں تھا ۔ !

دولہا کا لباس ابھی تک اس کے زیبِ تن تھا ۔ زماں کو ذرا سی بھی فرصت نہیں مل سکی تھی وہ انتظامی امور میں اس حد تک مصروف تھا کہ ساجد سے بات کرنے کی مہلت بھی میسّر نہ آئی تھی ۔۔۔ اور اب جبکہ یہ فرصت ملی تھی تو وہ دونوں سَر جوڑے ہوئے بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے کہ ناہید کیوں نہیں آئی ۔۔۔ اُسے تو آجانا چاہیئے تھا ۔ !

کیا وہ ناراض ہے ۔؟

یہی سوال رہ رہ کر ساجد کے دل میں اُبھرتا تھا ۔ اُسے اب یقین ہو چکا تھا کہ ناہید اس سے ناراض ہے ۔۔۔ لیکن بالفرض وہ ناراض ہوتی تو..... پچاس ہزار کا چیک کاٹ کر کیوں بھیجتی ؟ ۔ خان صاحب بھی حیرت زدہ تھے اور سہیلیوں کے جھرمٹ میں گھری ہوئی کِشور بھی پریشان تھی ۔ آخر یہ سب کیا ہے ۔۔۔ ؟

کوئی بہن اپنے بھائی سے اِس حد تک ناراض ہو سکتی ہے !

اور پھر اس سوال کا جواب ایک تار کی صورت میں مِل گیا ۔ تسنیم نے تار دیا تھا ۔ لکھا تھا ۔

" ناہید سخت بیمار ہے ۔۔۔ جلد آیئے ۔"

ساجد کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے ۔۔۔ پہلے تو وہ سمجھا تھا کہ یہ مبارکبادی تار ہوگا ۔ مگر اب یہ کیا معاملہ ہے ۔۔۔ ناہید سخت بیمار ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ شادی میں شرکت نہیں کر سکی ۔ تو پھر اب وہ کیا کرے ؟ ساجد نے اپنے دل سے سوال کیا ۔ اور پھر جیسے اُس نے ایک فیصلہ کر لیا ۔۔۔ وہ ابھی اور اسی وقت وہاں جائے گا ۔

ساجد کے اس فیصلے سے پورے گھر میں اُدھم مچ گیا — خان بہادر صاحب نے اس بار ساجد کو روکنے کی کوشش نہیں کی — اُنھوں نے کہا —

"بیٹا اِس وقت کوئی گاڑی نہیں جاتی — تم میری کار لے جاؤ، اسی طریقے سے تم وہاں جلد پہنچ سکتے ہو۔"

یہ خبر اتنی روح فرسا تھی کہ زماں بھی سکتے میں رہ گیا — محبوب چونکہ اپنی آنکھوں سے ناہید کی حالت دیکھ آیا تھا۔ لہٰذا اُسے بڑی تشویش تھی۔

جب وہ تینوں کار میں سوار ہونے لگے تو خان بہادر صاحب نے اُنھیں کچھ دیر کے لئے رک جانے کو کہا۔

زماں نے تشویشناک لہجے میں پوچھا۔

"کیا بات ہے ابّا — ہمارا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے —؟"

خاں صاحب تو کیا جواب دیتے، جواب دراصل کشور نے دیا۔ جس دلہن کے پیروں کی مہندی بھی ابھی میلی نہیں ہوئی تھی وہ اپنے سہاگ کے جوڑے ہی میں باہر نکل آئی اور اب اُسے اِصرار تھا کہ وہ بھی سب کے ساتھ کوسانی جائے گی۔ زماں نے اُسے منع بھی کیا مگر کشور دروازہ کھول کر کار میں بیٹھ چکی تھی۔

۳۱

کوسانی پہنچنے پر اُنھیں وہاں کا پتّا پتّا سوگوار نظر آیا۔ جھیل ساکت تھی۔ ہوائیں تھم چکی تھیں۔ چیڑ کے درخت اُداس کھڑے تھے اور خوش گلو طیور ان درختوں پر منھ لٹکائے خاموش بیٹھے تھے۔ ساجد سوچ رہا تھا کہ یہ "تغیر" ناہید کی بیماری کے باعث ہوا ہے؟

بنگلے کے باہر تسنیم بیتابانہ انداز میں کھڑی ہوئی نظر آ گئی تھی۔ شاید وہ اُنھیں پگڈنڈی پر آتے دیکھ کر باہر نکل آئی تھی۔ ساجد کو دیکھ کر اُس نے ہاتھ سے جلدی آنے کا اشارہ کیا اور پھر تیزی سے دوڑتی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی۔

ناہید ـــــ نہیں نہیں بلکہ ایک استخوانی پنجر مسہری پر دراز تھا۔ ہاں یہ ناہید تھی، وہی حسین و جمیل ناہید، جس پر کالج کے اَن گنت لڑکے فریفتہ تھے۔ جس کی چال میں رعنائی تھی۔ جس کا تبسّم دوسروں کی

جان لے لیتا تھا اور یہ ناہید آج اپنی جان سے جا رہی تھی!

اُسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ شوخ و چنچل ناہید ہے، جس کی اداؤں میں شوخی اور گفتگو میں ترنم تھا۔ جس کی آنکھیں شرارت سے چمکتی رہتی تھیں۔ جس کے حسین اور یاقوتی لبوں پر تبسم نثار ہوتا رہتا تھا ـــ کیا یہ وہی ناہید ہے؟

دھنسی ہوئی بے قرار آنکھیں، موت سے آخری جنگ کرتا ہوا ڈھلکا سینہ، ہڈیوں کی نمائش کرتا ہوا مریل جسم اور اندر کی طرف پچکے ہوئے گالوں والی لڑکی، بے شک کسی زمانے میں ناہید کے نام سے یاد کی جاتی تھی۔

"ناہید ـــ ناہید ـــ ساجد صاحب آگئے۔" تسنیم وفورِ مسرت سے روتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

ناہید نے سُنا مگر بول نہ سکی۔

"سنتی ہے یا نہیں ـــ ساجد صاحب آگئے ناہید ـــ" تسنیم نے اُسکے کان کے قریب چیخ کر کہا۔

"اچھا ـــ" ناہید نے کھوکھلی آواز میں کہا۔ ایک پژمردہ تبسّم اُسکے سوکھے ہونٹوں پر پیدا ہوا۔ مضطرب آنکھوں سے دروازے کو دیکھا اور پھر اٹک اٹک کر بڑی مدھم آواز میں رک رک کر بولی۔ "زہے نصیب، وہ آ رہے ہیں ـــ لیکن میں جا رہی ہوں۔"

تسنیم نے اُس کے لبوں سے کان لگا کر یہ لفظ سُنے اور پھر سنتے ہی رونے لگی۔ ناہید موت سے جس طرح لڑ رہی تھی، تسنیم بیچ میں کود کر اس لڑائی کو رکوا دینا چاہتی تھی اور پھر یہ جنگ رُک گئی ـــ سکون ہی سکون ـــ ایک ابدی سکون ناہید کو مل گیا۔ دروازے کی طرف لگی ہوئی اس کی پُرحسرت آنکھیں اُسی

سمت میں مرکوز ہو کر کھلی کی کھلی رہ گیئں۔

ساجد سب سے پہلے اندر داخل ہوا۔ تسنیم ہڈیوں کے ڈھانچے سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ وہ دھک سے رہ گیا۔ اُس نے کبھی خواب میں بھی یہ نہ سوچا تھا کہ وہ ناہید کا یہ دردناک انجام دیکھے گا۔ پوری قوّت سے وہ حلق پھاڑ کر چلّایا ـــــ ناہید! ـــ اور پھر دوڑ کر اس کے بستر کی طرف بڑھا۔

"نہیں ـــ نہیں ـــ" تسنیم بپھری ہوئی شیرنی کی طرح کھڑی ہو گئی۔ اس نے ساجد کو دونوں ہاتھوں سے دھکّا دے دیا۔ "میں تمہارے گندے ہاتھ اِس کے پاک جسم کو نہیں لگانے دوں گی ـــ تم ظالم ہو ـــ تم نے میری سہیلی مجھ سے چھین لی ہے ـــ چلے جاؤ۔ چلے جاؤ۔"

کشور نے پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی تسنیم کو سنبھالا اور پھر ناہید کی نبض ٹٹول کر دیکھی۔

قفس خالی تھا اور پرندہ آزاد ہو چکا تھا۔!

"تم نے اِسے مار ڈالا ـــ تم نے اُس کی زندگی چھین لی ـــ" تسنیم آہ و بکا کرتی رہی۔

"ہاں ـــ ہاں میں ہی خطاوار ہوں ـــ" ساجد کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے اور وہ تسنیم کو دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ "میں اسی لائق ہوں تسنیم میں اسی لائق ہوں ـ"

زماں اور محبوب سکتے کے عالم میں کھڑے ہوئے ناہید کے سرد جسم کو دیکھ رہے تھے۔ آخر زماں نے آگے بڑھ کر اس کی کھلی ہوئی بے نور آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے بند کر دیا۔

کشور نے بڑی مشکل سے تسنیم کو قابو میں کیا۔ تسنیم نے اب غور سے ساجد کو دیکھا وہ کرسی پر بیٹھا ہوا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

"اب رونے سے کیا فائدہ ساجد صاحب۔" تسنیم نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ "اُسے آپ پر سے قربان ہونا تھا۔ ہو گئی۔"

"مگر یہ سب اتنی جلد کیسے ہو گیا تسنیم۔ ناہید نے میرا اتنا بھی انتظار نہیں کیا؟"

"انتظار سے فائدہ بھی کیا تھا۔" تسنیم سسکیاں لے کر بولی۔" وہ آپکو اس لباس میں نہیں دیکھنا چاہتی تھی جس نوشہ والے لباس میں آپ آئے ہیں۔ وہ آپ کی پجارن تھی۔ اُس نے آپ کو اپنا معبود سمجھ کر آپ کی خاموش پرستش کی ہے۔"

"تسنیم۔ !ساجد رونا بھول کر اُسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

تسنیم نے پیار سے مُردہ ناہید کے گالوں کو چھو کر گلوگیر آواز میں کہا۔ "تم مجھے اب منع نہیں کر سکتیں۔ تم مسکرا رہی ہو نا، ضرور مسکراؤ۔ مگر اب تم مجھے وہ راز کہنے سے نہیں روک سکتیں جسے اپنے دل میں رکھ کر تم عشق کی آگ میں بھسم ہو چکی ہو۔ پاگل لڑکی۔ تو نے میرا کہنا نہ مان کر خود پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔"

اتنا کہہ کر تسنیم نے چادر اوپر کھسکا کر ناہید کا چہرہ ڈھک دیا اور پھر ساجد سے مخاطب ہوئی۔

"ہاں ساجد صاحب۔ دل پر جبر کر کے سُنیئے کہ ناہید آپ کو بھائی کی طرح نہیں بلکہ اپنے محبوب کی طرح چاہتی تھی۔ وہ آپ سے عشق کرتی تھی۔ آپ پر پروانہ وار فدا تھی۔ وہ آپ کو دیکھ دیکھ کر ہی جیتی تھی اور آپ کو ہی اپنا

دیوتا تصوّر کرتی تھی ۔"

"کیا ــــ ؟ ساجد صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ سب بھونچکے ہو کر تسنیم کو دیکھنے لگے ۔

"ہاں ــــ وہ آپ پر سے قربان ہو گئی ساجد صاحب ۔ ایسی وفا کی مورت، ایسی خاموش عشق کرنے والی صورت اب آپ کو کہیں نہ ملے گی ۔"

تسنیم پھر رونے لگی۔ اتنا روئی کہ دوسروں کے لئے اُسے چپ کرنا مشکل ہو گیا۔

جب وہ ذرا اعتدال پر آئی تو اُس نے ناہید کے سرہانے سے ایک سربمہر لفافہ نکال کر ساجد کی طرف بڑھایا اور بولی۔

"اِسے کھولئے ۔"

ساجد نے لرزتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔ اُس کے آنسو لفافے پر ٹپک رہے تھے ۔ اور وہ کوٹ کی آستین سے اُنھیں بار بار پونچھ رہا تھا۔ کچھ سرکاری کاغذات لفافے میں سے برآمد ہوئے۔ اُن پر ایک نظر ڈالتے ہی ساجد نے چلّا کر اُنھیں ایک طرف پھینک دیا اور پھر دوڑ کر اُس نے ناہید کے پیر پکڑ لئے اس کے بعد وہ اِن پیروں سے لپٹ کر دھاڑیں مارنے لگا۔

ناہید نے اپنی مکمل جائداد ساجد کے نام کر دی تھی ۔

"اس کے علاوہ بھی ایک چیز اور ہے ۔" تسنیم نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ آپ میں اگر سننے کی ہمّت ہے تو سُن لیجئے کہ آپ کی شادی کرانے والی یہی مظلوم ہستی تھی جو اس وقت مسہری پر دراز ہے ۔ ساجد صاحب! اُس نے نعمان صاحب سے صرف اِسی شرط پر شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا کہ یہ اپنی بہن کشور آپ کو دے دیں گے ۔"

"ہاں ساجد ـــــ" زماں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "ناہید نے یہی شرط عائد کی تھی اور میں نے اِسے منظور کر لیا تھا۔"

ساجد دیوانوں کی مانند ایک ایک کی صورت دیکھنے لگا۔

"اِسی نے خان بہادر صاحب کو خط لکھا کہ وہ آپ کی شادی کشور سے کر دیں۔" تسنیم پھر سسکیاں لینے لگی۔ "اسی نے اُنھیں مجبور کیا تھا ساجد صاحب"

کشور کے آنسو شدت سے بہہ رہے تھے اور اب وہ ساجد کے قریب آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ محبوب کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اُسے اب احساس ہو رہا تھا کہ اس نے بارہا ناہید کو افسردہ سا دیکھا تھا دراصل اس کی وجہ کیا تھی۔ اُسے تسنیم کے ساتھ اس کی وہ گفتگو بھی یاد آرہی تھی جو وہ پانچ دن پہلے اپنے کانوں سے سُن چکا تھا۔ تسنیم نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا تھا کہ اب وہ برداشت نہیں کر سکتی اور ایک ایک بات کہہ دینا چاہتی ہے ـــــ اس کا دل وہ باتیں یاد کر کر کے رو رہا تھا۔ کاش! اگر اُسے اسی وقت احساس ہو جاتا تو نوبت یہاں تک نہیں پہنچتی۔

"خیر ـــ اب تو سب کچھ ختم ہو چکا ـــــ وہ ہستی ہی ختم ہو گئی جس کے بارے میں ہم سب سوچ رہے ہیں۔ لیکن ساجد صاحب۔" تسنیم نے گردن اُٹھا کر ساجد کو دیکھا۔ "میں ان آخری لمحات میں اس کے ساتھ رہی ہوں اور اُس کرب درد سے خوب واقف ہوں جو گذشتہ دنوں اس کے دل و دماغ پر حاوی تھا۔ یہ لیجئے، یہ آپ کے لئے ہی ہے۔"

تسنیم نے ہاتھ بڑھا کر الماری کی ایک دراز میں سے ہاتھی دانت کا بنا ہوا ایک ڈبہ نکالا اور پھر یہ ڈبہ ساجد کے ہاتھ میں دے دیا۔

"یہ ناہید کے وہ خطوط ہیں جو وہ روزانہ آپ کو لکھتی تھی مگر آپ کو ڈالتی

نہیں تھی۔ ان خطوں کا ایک ایک لفظ وہ مجھے رو رو کر سُنانی تھی۔ بڑے درد انگیز خط ہیں ساجد صاحب۔ میں نے ایک بار کہا بھی تھا کہ میں ان خطوط کو سپردِ ڈاک کر دوں، مگر اُس نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا۔ آپ اُس کے قریب ہیں خدا کیلئے اب تو اِن کو پڑھ لیجئے ــــ وہ یہ ڈبہ شادی کے تحفے کے طور پر آپ کو بھیجنا چاہتی تھی مگر بھیج نہ سکی ۔"

روح کو جسم سے جدا ہوتے وقت جو حالت ہوا کرتی ہے، ہو بہو وہی کیفیت ساجد کی تھی۔ اُس کی آنکھیں وحشت کے باعث پھیل گئی تھیں۔ پورے جسم میں رعشہ پیدا ہو گیا تھا۔ اُسے خود بھی احساس نہیں تھا کہ اس کی حرکات و سکنات کیا ہیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس نے ڈبہ کھولا۔ ڈبے میں خطوط نہیں تھے۔

بس سیاہ راکھ ڈبے کے اندر بھری ہوئی تھی۔

اور اِس راکھ کے اوپر گلاب کی ایک کلی رکھی ہوئی تھی۔

ایک چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ بھی تھا۔ آنسوؤں کی بارش کے پیچھے سے ساجد نے اُسے پڑھا۔

"میرے ساجد! شادی مبارک!

تمہارے نام یہ خط لکھے تھے میں نے ــــ ہوں نا بالکل پاگل۔

جو خط بھیجنے نہیں تھے اُنھیں لکھا کیوں تھا میں نے ــــ؟

ساجد نے لرزتے ہاتھوں سے ناہید کے چہرے پر سے چادر نیچے کر دی۔

وہ مسکرا رہی تھی۔ ایک ابدی مسکراہٹ ــــ ساجد نے پھر پڑھنا شروع کیا۔

"اس کا جواب میرے پاس بھی نہیں ہے۔ یہ کم بخت دل کی حرکت ہے ــــ میں قصوروار نہیں ہوں۔ تقریباً سَو سے زیادہ خط تھے یہ ــــ تمہاری شادی کا سُن کر میں نے انھیں

جلا دیا ہے — اور یہ کلی، یہ نوشگفتہ کلی۔ یہ میری محبّت ہے ساجد — میری لازوال محبت —
بس اب اور کچھ نہیں کہنا سوائے اِس کے۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہو گئے خاک انتہا یہ ہے — "

منزلیں پیار کی (نفسیاتی ناول) ڈاکٹر سیفی پریمی

ہمارے سماج میں کئی جزیرے ہیں جن میں لڑکیاں پھسل کر پہنچ جاتی ہیں۔ کچھ دن بعد وہ نفسیاتی الجھن کا شکار بن جاتی ہیں۔ صرف سماج کا دیا ہوا سپردگی کا جبر ہی ان کی شرافت کا معیار باقی رہ جاتا ہے "عورت" فنا ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر سیفی پریمی نے اپنے ناول "منزلیں پیار کی" میں نوعمری اور دولت کے جزیروں میں دو حسین لڑکیوں کی گرفتاری اور رہائی کی نفسیاتی داستان پیش کی ہے۔ ہمیں اپنے سماج کی خامیوں کا جائزہ لینے جذبہ اور حیثیت کے فرق کو محسوس کرنے تیز نفسیاتی اور جنسیاتی نقطۂ نگاہ سے ازدواجی زندگی کو سمجھنے کیلئے یہ ناول ایک معتبر ذہنی رفیق ہے۔

قیمت -/۸

جلیس (ناول) انور کمال حسینی

زمانہ بدل گیا، زندگی کی قدروں میں تبدیلی آگئی، لیکن آج بھی انسان بہت سے معاملات میں روایتوں کا شکار اور رسموں کا غلام ہے۔ آہوں کراہوں اور تلخیوں میں ڈوبی ہوئی یہ داستان صرف جلیس نامی طوائف ہی نہیں بلکہ ایک پورے معاشرے کا آپریشن ہے۔ انسانی تہذیب کی عکاسی ہے۔

قیمت ۴/۵۰

اللہ میگھ دے (ناول) رضیہ سجاد ظہیر

قدیم و جدید نظریات کا ٹکراؤ۔ محبت کی کسک، قدیم روایتوں اور قدروں کا احترام، بے لوث خدمت کا جذبہ اور دوسری طرف خود غرض سیاست اور ناکارہ سیاسی مشینری کی حماقتیں اس ناول میں اس خوبی سے پیش کی گئی ہیں کہ اسکے ذریعہ آج کے لکھنؤ کی فلمی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے اور بے ساختہ کلمۂ تحسین منہ پر آجاتا ہے۔

قیمت ۴/۵۰

الجھی ڈور (ناول) صالحہ عابد حسین

آج کی نوجوان لڑکیاں کن کن الجھنوں کا شکار ہیں۔ ان کے ذہنوں میں کس قسم کے خیالات پرورش پا رہے ہیں۔ وہ مستقبل کو کس زاویے سے دیکھتی ہیں؟ یہ ناول اسی

کش مکش کو پیش کرتا ہے۔ قیمت ۴/۵۰

پابہ جولاں (ناول) صغرا مہدی

یہ ناول نئے دور کے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے مسائل، ان کی مشکلات اور ان کی ذہنی کیفیات کو پیش کرتا ہے۔ کردار نگاری اور جذبات کا بہترین شاہکار۔ قیمت ۶/-

دوسرے کنارے تک (ناول) عزیز قیسی

یہ کہانی ایک لڑکی کی ہے۔ جو ہندوستان کے کسی بھی کونے میں آپ کو مل سکتی ہے۔ گھر کے اندھیرے میں بند، ماں باپ سے کھنچی کھنچی، اپنے آپ سے گھبرائی ہوئی لڑکی جس کی آنکھوں میں ایک نہیں ہزاروں افسانے ہیں۔ ہزاروں، لیکن پھر بھی زبان خاموش ہے بالکل خاموش۔ قیمت ۳/۵۰

اپنی اپنی صلیب (ناول) صالحہ عابد حسین

دنیا کی اس چہل میں ہر انسان اپنے دکھ درد کا بوجھ، اپنی اپنی صلیب، اپنے کندھوں پر اٹھائے چلا جا رہا ہے۔ ایک دوسری کی تکلیفوں اور مصیبتوں پر بے دردی سے ہنستا ہے۔ یا ہمدردی سے کڑھتا ہے۔ مگر کوئی کسی کا غم بانٹ نہیں سکتا۔ اسی کا نام زندگی ہے اور اسی زندگی کی جیتی جاگتی دلکش اور دلفریب تصویر صالحہ عابد حسین نے اپنے جادو نگار قلم سے اس خوبصورت ادبی پارے میں کھینچی ہے۔ قیمت ۸/-

کالا شہر گورے لوگ (ناول) احسان الحق

"کالا شہر گورے لوگ" ایک بین اقوامی ناول ہے جس کا میدان عمل ملکی سرحدوں مذہبی دیواروں اور رنگ و نسل کی تفریق سے بھی آگے نکل گیا ہے۔ یہ آج کا ناول ہے، مستقبل کا ناول ہے۔ گذشتہ کل سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ قیمت ۵/-

